راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 18 واں سال

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

Monthly
Arxang
Lahore

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی

مارچ 2017ء

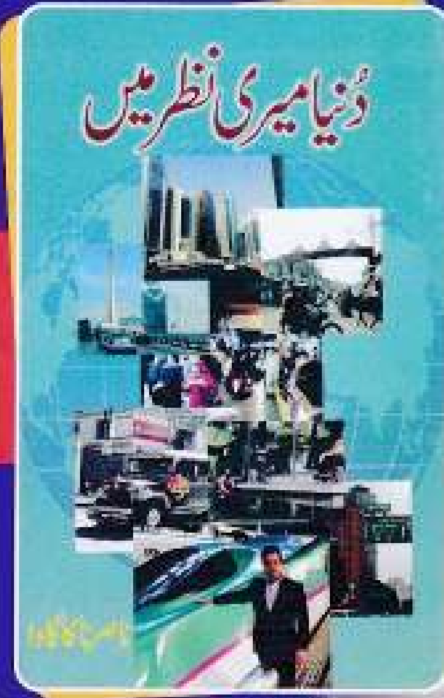

دُنیا میری نظر میں

عامر بن علی

ناصر ناکاگاوا کا خوبصورت سفرنامہ

جرمنی سے تعلق رکھنے والے عالمی شہرت یافتہ سفرنامہ نگار جینو، جن کا امریکہ کے متعلق تحریر کردہ سفرنامہ انٹرنیشنل بیسٹ سیلرز میں شمار ہوتا ہے، اور لیتھونیا سے تعلق رکھنے والی مصنفہ ڈاکٹر والیا سا پالحوئی کا مجھے چند برس قبل "ارژنگ" کے لیے انٹرویو کرنے کا موقع ملا۔ میں نے سادہ سا سوال کیا تھا کہ کیا سفرنامہ فکشن ہے؟ دونوں مصنفین کا مشترکہ جواب اثبات میں تھا۔ مزید ڈاکٹر والیا کا کہنا تھا اگر سفرنامے سے کہانی کا عنصر نکال دیا جائے تو وہ محض گائیڈ بک بن کر رہ جائے گا۔ فقط حقیقت نگاری کسی سفر کی روداد کو اچھا بنانے کے لیے ناکافی ہے۔ نیز سفرنامے کی خوبصورتی یہی ہے کہ اس میں ادب کی تمام اصناف سماسکتی ہیں۔ اردو سفرنامے کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ عمومی طور پر مسافرنامہ ہوتا ہے۔ سفرنامہ نگار کا ہیرو ہونا بھی ہمیں گوارا ہے مگر کردہ و ناکردہ گناہوں کا بیان اور سینے کی دبی ہوئی سفلی خواہشات کو واقعات بنا کر پیش کرنا قارئین پر گراں گزرتا ہے۔

میرے اکثر سفرنامہ نگار دوست کتاب کی فروخت بڑھانے کے لیے اپنے اوپر بے جا بہتان طرازی کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ ایسے ماحول میں ناصر ناکاگاوا کا سفرنامہ "دنیا میری نظر میں" تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ یہ سفر کے تجربات کو اچھوتے اور بالکل منفرد انداز میں پیش کرتا ہے۔ بلاشبہ ثبات مسافر کو نہیں، سفر کو حاصل ہے، محسوس ہوتا ہے کہ اس حقیقت کو ناصر ناکاگاوا نے پالیا ہے۔ اسی سبب سے اس کتاب میں آپ کو ناظر کم اور منظر زیادہ تر دکھائی دے گا۔ "دنیا میری نظر میں" مصنف کا دوسرا سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامے میں آپ کو وہ تمام خوبیاں نظر آئیں گی۔ جو ان کے پہلے سفرنامے "دیس بنا پردیس" میں پائی جاتی ہیں۔ پہلی ملاقات میں ناصر ناکاگاوا کے بارے میں میرا یہ تاثر قائم ہوا کہ وہ ایک انتہائی مہذب، حساس، نرم خو اور انسان دوست شخصیت ہیں، جب ان کی تحریروں کے مطالعے کا موقع ملا تو ان کی شخصیت کی مذکورہ خوبیاں ان کی تحاریر میں بھی جا بجا نظر آئیں۔ جاپان میں رہتے ہوئے انہوں نے ہمیشہ اپنے ہم وطن پاکستانیوں کی علمی اعتبار سے مدد کی ہے۔ ان کی قائم کردہ ویب سائیٹ اردو ویب نہ صرف جاپان میں مقیم پاکستانیوں کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر رہی ہے۔ بلکہ اردو زبان کی ترویج کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ میرے مربی بابا جی اشفاق احمد اکثر دعا دیا کرتے تھے کہ "اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے" اس اعتبار سے میں ناصر ناکاگاوا کے سفرنامے کو ایک صدقہ جاریہ کہتا ہوں کہ اس کے مطالعے سے بہت سارے پاکستانی تارکین وطن کو فائدہ پہنچے گا۔ اردو ادب میں جہاں خودنمائی کے نقطہ نظر سے لکھے گئے سفرناموں کی بھرمار ہے، وہاں "دنیا میری نظر میں" ایک منارہ نور اور روشن مثال ہے، کہ سفرنامے کو انسانیت کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر بھی تحریر کیا جا سکتا ہے۔ ڈیڑھ صدی پیشتر سرسید احمد خاں کے لندن سے متعلق تحریر کیے گئے سفرنامے سے ہوتے ہوئے حکیم محمد سعید کی جاپان کے سفر سے متعلق لکھی گئی روداد اور عہد موجود تک بہت ساری اچھی مثالیں بھی اس بابت موجود ہیں، جن مصنفین نے نیکی کے جذبے کے تحت اپنے سفر کے تجربات و تاثرات کو قلمبند کیا۔ مطمع نظر یہ تھا کہ بعد میں آنے والے مسافروں کا بھلا ہو سکے۔ یہ سفرنامہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

"دنیا میری نظر میں" میں شامل اکثر تحریریں اردو ویب جاپان کے پلیٹ فارم سے قارئین تک پہنچتی رہی ہیں۔ ان تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کروانا قابل تحسین عمل ہے۔ شاہ صاحب کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے جاپان میں ربع صدی گزاری اور سماج کا گہرائی میں مشاہدہ، مطالعہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں جاپانی زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ یہاں مقیم پاکستانی کمیونٹی میں شاید ہی دو، چار فیصد لوگ اتنی اچھی جاپانی زبان جانتے ہوں گے، جتنی مہارت مصنف کو حاصل ہے۔ زبان کسی بھی ثقافت کا DNA ہوتی ہے۔ جتنی بہتر آپ زبان جانتے ہوں گے، اتنے ہی زیادہ اچھے انداز میں آپ کسی قوم اور معاشرت کو سمجھ سکیں گے۔ ناصر ناکاگاوا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوصف، اکثر تارکین وطن سے متعلق جاپانی قوانین آسان اردو زبان میں سمجھانے کی تحریری سعی کرتے رہتے ہیں۔ "دنیا میری نظر میں" کے مطالعے کے بعد یہی عرض کروں گا کہ بیان چاہے جاپان کا ہے یا پھر کسی اور دیس کے متعلق، ناصر ناکاگاوا کی نظر سے دیکھنے سے دنیا اور زیادہ خوبصورت نظر آئی ہے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ کتاب لاہور سے شائع ہوئی ہے، انتہائی اعلیٰ طباعت، آفسٹ پیپر، کے ساتھ اچھے کتب خانوں پر باآسانی دستیاب ہے۔ جو احباب خصوصاً جاپان کا سفر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، میرا انہیں مشورہ ہے کہ یہ کتاب ضرور پڑھیں۔

ساوی وائز ٹیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ارژنگ

مارچ 2017 شمارہ 3

مدیر اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

⊙ سید اسد رضوی ⊙ سعدیہ کیفی (معاون)

{مجلس مشاورت}

محمد ظفر اقبال ہاشمی (مستشار) ⊙ ظفر خان (مدیر) ⊙ ارشد ندیم سیال (...)

محمد ادریس لاہوری (...) ⊙ نازو کاظمی ⊙

کمپوزنگ و ڈیزائننگ : 0321-4736760 رابطہ : 0333-4918383

اسسٹنٹ ایڈیٹر ⊙ محمد احسن گل : 0300-4529821

ماہنامہ ارژنگ

F-3 ...

حسن عباسی : 0300-4489310 رابطہ : 0301-4482133

nastaliqus786@gmail.com

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے صرف ڈاک خرچ بھیجیں/1000 روپے

بذریعہ ... سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ ... ادبی ادارے کی بھی جائے گی۔

(احسن محمود) 0300-4489310

31304-7298366-9

چندہ سالانہ (پاکستان) 1000 روپے ⊙ ڈاک خرچ ... 6000 روپے

رابطہ : 0300-4489310 - 0331-4489310

فہرست

نعت

مضامین:

○ رخسانہ نور...... چند یادیں / ڈاکٹر کوثر محمود ' ۳
○ صدق آفریں انتخابِ نعت / ریاض حسین زیدی ' ۵
○ خالقِ آرزو، شکستِ آرزو کا نوحہ گر / محمد افتخار شفیع ' ۶
○ جعفر حسن مبارک کا سفرنامہ "دریائے صحرا تک" / دستگیر شہزاد ' ۷
○ اقرار مصطفیٰ...... اقرار کے آئینے میں / احسن ریاض ' ۹
○ محمد نعیم یاد کے "پتھر روتے ہیں" / نازو کاظمی ' ۱۲
○ ماہنامہ ارژنگ اور اس کے گوشہ جات کی ادبی اہمیت و افادیت / امیر محمد خالد حزل ' ۱۳
○ لاہور / فرح ناز ' ۱۸
شعری گوشے: فیصل ہاشمی، ریاض شاہد، راول حسین ۲۱ تا ۲۳

سفرنامہ:
○ تیرے روبرو / عاشق رحیل ' ۲۴
○ سفرنامہ تھائی لینڈ / وحید قندیل ' ۲۶
○ خوش اخلاق مہذب اقوام کا شیوہ / تابندہ ضیا ' ۲۸
○ خاندانی بہو / محمد ایوب صابر ' ۳۰
○ تھکے مسافر کی منزل / آصف عمران ' ۳۳

افسانے:
○ میرے درد کو جو زباں ملے / نادیہ بشیر احمد ' ۳۹
○ آرام طلب / سعدیہ بتول ' ۴۲
○ دی گریٹ راوین اُستاد...... پروفیسر صابر لودھی / امجد ساجد ' ۴۵
○ پھانسی / داؤد کاکڑ ' ۴۷
شاعری (غزل، نظم) ' ۴۸
آپ بیتی: مرشدی عطاء الحق قاسمی / تنویر ظہور ' ۵۳
ادبی تعارف ' ۵۶
مختصر ادبی خبریں ' ۵۷
تبصرۂ کتب ' ۵۹
نامہ ہائے احباب ' ۶۲

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد

صرف ہاتھوں کو نہیں میں نے اٹھا رکھا ہے
اپنی آنکھوں کو بھی کشکول بنا رکھا ہے
میں تو ہر حال میں ہوں تیری رضا پر راضی
سرِ تسلیم ترے در پہ جھکا رکھا ہے
تیری یادوں سے مرے دل کا نگر ہے آباد
تیری چاہت کے سوا دنیا میں کیا رکھا ہے
میں نے ہر بار ترے حکم سے سرتابی کی
تو نے ہر بار بھرم میرے خدا رکھا ہے
میں بھکاری ہوں ترے در کا ازل سے مولا
تیری جانب ہی نگاہوں کو لگا رکھا ہے
کس قرینے سے مرے خالق و مالک تو نے
آسماں چاند ستاروں سے سجا رکھا ہے
گر ہیں رسوائے زمانہ تو گلہ کیا ہم نے
تیرے قرآن کو صد حیف بھلا رکھا ہے
یہ سعادت بھی کوئی کم تو نہیں ہے یارب
تو نے خورشید کو مصروف ثنا رکھا ہے

خورشید بیگ میلسوی / میلسی

تمام بچھڑے ہوئے دل ملے انہی کے سبب
محبتوں کے ہیں سب سلسلے انہی کے سبب
انہی کی ذات ہے مرکز سو اہل ہجر کے بیچ
ڈھلے ہیں قرب میں سب فاصلے انہی کے سبب
ہم اہل غم کو جو رہتے تھے اپنی قسمت سے
ہوئے ہیں دور وہ شکوے گلے انہی کے سبب
انہی کے در پہ ہوئے جمع پھر دریدہ دل
کہ زخم ہائے جگر بھی سلے انہی کے سبب
رہِ حیات کی منزل سے روشناس ہوئے
تمام بھٹکے ہوئے قافلے انہی کے سبب
ہر ایک ظلم کے طوفاں میں بے کسوں کے شباب
چٹان بنتے گئے حوصلے انہی کے سبب

شہاب صفدر / اسلام آباد

اے زائر مدینہ جانا سنبھل سنبھل کر
راہ درِ نبیؐ پہ چلنا سنبھل سنبھل کر
درِ مصطفیٰؐ پہ جا کر رکنا سنبھل سنبھل کر
پھر ان کی بارگہ میں جھکنا سنبھل سنبھل کر
قرآں میں خدا نے لا ترفعوا کہا ہے
کہنا سنبھل سنبھل کر سننا سنبھل سنبھل کر
یہ نعت مصطفیٰ ہے کوئی شاعری نہیں
اے واصفِ نبیؐ تم لکھنا سنبھل سنبھل کر
عمران جب کبھی آئے ربّ کا بلاوا
جانا سنبھل سنبھل کر آنا سنبھل سنبھل کر

عمران مفتی / میاں والی

ہستی کا کچھ وجود نہ تھا آپؐ کے بغیر
خوشبو سے بے خبر تھی ہوا آپؐ کے بغیر
غنچوں کو آپؐ نے دیا اذن شگفتگی
ہاتھوں میں آ نہ پائے صبا آپؐ کے بغیر
میری ہر اک دعا کا وسیلہ حضورؐ ہیں
کیا ہو قبول کوئی دعا آپؐ کے بغیر
صدیوں سے تار تار تھا پیراہن حیات
کرتا رفو یہ کون قبا آپؐ کے بغیر
میں آپ کے بغیر کسی کام کا نہیں
کوئی نہیں حضورؐ مرا آپ کے بغیر
ہے میرا افتخار غلامی حضورؐ کی
ورنہ مری بساط ہی کیا آپؐ کے بغیر

افتخار شوکت / لاہور

کرم کا سمندر مدینہ مدینہ
اندھیرے میں خاور مدینہ مدینہ
کھلا دے الٰہی دعاؤں کے نیچے
بنا دے مقدر مدینہ مدینہ
لبوں پہ ہے میرے محمدؐ محمدؐ
ہے دھڑکن کا محور مدینہ مدینہ
ہیں جنت کا منظر مدینے کی گلیاں
دو عالم ہے زیور مدینہ مدینہ
چمکتے دمکتے مدینے کے ذرے
معطر معطر مدینہ مدینہ
تخیل تخیل ہے مدحت نبیؐ کی
سخنور سخنور مدینہ مدینہ
دعائیں بھی کر رہے ہیں یہ شافی
کہ ہو نقش دل پہ مدینہ مدینہ

عقیل شافی / لاہور

رُخسانہ نور...... چند یادیں

ڈاکٹر کوثر محمود/ راولپنڈی

رخسانہ نور سے شناسائی، بلکہ روشناسائی تو کافی عرصے سے تھی لیکن رسمی تعارف ۲۰۰۱ء میں ہوا۔ فیصل آباد میں نظم کے معروف شاعر، ڈاکٹر وحید احمد کی کتاب کی رونمائی تھی، جاوید آفتاب اور زاہد حسن کے ساتھ، لاہور سے فیصل آباد جانے کا پروگرام بنا لیکن سوئے اتفاق سے وہ فنکشن گذر گیا اور ہم دیر سے پہنچے۔ انجم سلیمی نے کہا کہ اب آگئے ہیں تو امریکہ سے آئی ہوئی ایک شاعرہ کے اعزاز میں مشاعرہ ہو رہا ہے، آپ اُس میں ضرور نظم پڑھیں۔

ضلع کونسل، فیصل آباد کے ہال میں مشاعرہ تھا اور سٹیج پر امریکہ سے آمدہ شاعرہ کے ساتھ رخسانہ نور بھی تھی۔ مشاعرے کے اختتام پر غیر ملکی شاعرہ کو مقامی شاعروں نے نرغے میں لے لیا تو رخسانہ نور جاوید آفتاب اور زاہد حسن کی طرف آئیں اور علیک سلیک کی: مذکورہ اصحاب نے میرا تعارف بھی کرایا کہ یہ ڈاکٹر کوثر محمود ہیں اور نظم کے شاعر ہیں۔ جاوید آفتاب کو رخسانہ نے کہا کہ مشاعرے کے بعد فلاں ریسٹورنٹ میں ڈنر ہے تم بھی وہاں آؤ......ہم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ آئے ہیں...... ہاں ہاں ان کو بھی ساتھ لے آؤ......

اگست کی رات، بلا کا حبس، بے مزہ کھانا، شدید گرمی...... چھچھو تم کے شاعر، طویل گفتگوؤں کا سلسلہ، شاعروں کے والہانہ پن کے مزے لیتی در آمدی شاعرہ اور بھنائی ہوئی رخسانہ نور...... یہ منظر دیکھ کر میں نیچے اپنی گاڑی میں آ بیٹھا اور AC چلا کر سکون کا سانس لیا...... کچھ دیر بعد رخسانہ بھی نیچے اُتر آئی...... گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے کو نہ آتا تھا...... شاعر فٹ پاتھ پر بھی اپنی غزلیں سنانے پر مصر تھے...... چناب کلب میں ان کو شب بسری کرنا تھی...... میں نے کہا فٹ پاتھ پر گرمی میں کھڑے رہنے سے بہتر ہے کہ گاڑی میں آ جائیں...... وہ شاعرہ بھی آ گئی...... ان کو چناب کلب لے جانے والی گاڑی کا AC خراب تھا...... ڈاکٹر صاحب آپ ہمیں کلب تک چھوڑ دیں...... میں اس شہر میں اجنبی ہوں مجھے راستہ نہیں آتا کسی مقامی شاعر کو ساتھ بٹھا لیں...... کئی شاعر آگے بڑھے......

رخسانہ نے تحکما کہا...... نہیں ہمارے ساتھ کوئی نہیں بیٹھے گا آپ اپنی گاڑی میں آگے چلیں ہم آپ کے پیچھے آتے ہیں...... چناب کلب میں بھی پرستاروں کا ہجوم...... کار سے اُترنے سے پہلے دعوت دی گئی کہ کل Holiday Inn لاہور میں بھی مشاعرہ ہے، وہاں ملاقات ہوگی......

لاہور میں بھی شاعروں اور پرستاروں کا ہجوم ...... سلام دعا سے نوبت آگے نہیں بڑھی...... ڈاکٹر صاحب مجھے میرے آفس چھوڑ دیں...... راستہ بھر کوئی بات نہیں کی، بس ایک گیان دھیان اور استغراق کی سی کیفیت...... میری ایک ضروری میٹنگ ہے میں آپ کو چائے آفر نہیں کر سکتی......

مشاعروں میں ادھر ادھر سلام دعا ہوتی رہی، دھیرے دھیرے ایک دوسرے سے شناسائی ہوتی گئی، اپنائیت کا تعلق تو بہت پہلے بن چکا تھا لیکن بعد ازاں ایک 'فاصلاتی دوستی' کا رشتہ بھی استوار ہوتا چلا گیا...... ایک ادبی تنظیم کی صدارت کے لیے میرے بعد رخسانہ کا انتخاب ہوا تو رخسانہ سے چائے پینے کی نوبت کئی سالوں بعد آئی......

ایک استغنا، سنجیدگی اور متانت کی چادر ہر وقت اوڑھے ہوئے شاعرہ رخسانہ اور فلمی دنیا کا ایک کامیاب حوالہ رخسانہ نور...... لیکن رفتہ رفتہ شاعرہ رخسانہ نور سے اپنائیت کا ایک تعلق استوار ہوتا گیا...... لیکن فلمی دنیا کی رخسانہ نور کی کوئی خبر نہ مل سکی......

رخسانہ نور نے اپنا شعری مجموعہ 'الہام' دیا تو پہلے صفحے پر لکھا...... ڈاکٹر کوثر محمود کے لیے اُنہی کے ایک جملے کے ساتھ کہ: "دوست وہی ہے کہ جس سے دوبارہ ملنے کو جی چاہے......"

مولانا کہاں ہیں آپ؟ جب بھی فون کرتی ہوں میں ہی کرتی ہوں، آپ کو تو فون کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی...... معافی تلافی...... پروین طاہر راولپنڈی سے آئی ہیں، چلو ڈی بلاک چل کر کباب کھاتے ہیں......

مولانا چشتیاں مشاعرہ ہے آپ کے ساتھ چلنا ہے...... پتہ ہے چشتیاں کتنی دور ہے؟ گاڑی کی پچھلی نشست پر شمی الماس اور سعد اللہ شاہ، فرنٹ سیٹ پر رخسانہ نور اور میں ڈرائیور...... یہ گول تکیہ کیوں رکھا ہے؟ اس کی افادیت واپسی کے سفر میں پتہ چلے گی، 24/25 گھنٹے لگیں گے آنے جانے میں...... ارے نہیں...... آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا......

راستے میں ساہیوال نہر کنارے ریسٹورنٹ پر لنچ...... شام کو چشتیاں میں مشاعرہ...... شاعروں اور پرستاروں کا ہجوم...... رات کے بارہ بج گئے...... چلیں مولانا واپس چلتے ہیں......

صبح چار بجے سے پہلے ممکن نہیں...... کیوں؟...... راستہ خطرناک ہے، ڈاکوؤں کا خطرہ ہے...... صبح چار بجے پہلی بس لاہور کے لیے نکلے گی، اُس کے پیچھے لگ کر نکل جائیں گے...... مارے گئے...... اور

بھکتو......رات بارہ بجے چشتیاں بس سٹینڈ پر پھر مشاعرہ منعقد کیا...... چائے کے کئی دور چلے......ٹوٹی پھوٹی کرسیوں پر وقت گذارا......حرام ہو جو کسی مقامی شاعر کو توفیق ہوئی ہو کہ خواتین کو ہی اپنے گھر میں کچھ آرام کرنے کا کہیں......میں پچھلی سیٹ پر گاؤ تکیے پر سہارا لیتی ہوں، ڈاکٹر صاحب میری تو کمر ٹوٹ گئی......تم بھی اگلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ...... شاہ جی چشتیاں ہی رُک گئے......اگلے دو گھنٹے آرام کر لو...... ساہیوال پہنچ کر کسی ریسٹورنٹ میں ناشتہ کریں گے۔ عارف والہ آتے آتے صبح کا اجالا پھیل گیا......پھر خوب باتیں ہوئیں، گانے ٹپے گائے......آئندہ کسی دور کے مضافاتی مشاعرے میں جانے سے توبہ کی......

پھلروان، سرگودھا سے افضل گوہر کا مشاعرے کے لیے اصرار ہے......تم جاؤ گے تو میں جاؤں گی......نہ میرے کندھے پر بندوق رکھ کر مت چلاؤ......اسی روز میری لندن کے لیے فلائٹ ہے...... چلو تم راولپنڈی سے آجانا میں لاہور سے آجاؤں گی......غالباً پھلروان کی تاریخ کا تاریخی مشاعرہ تھا، ڈھائی تین سو کے قریب سامعین تھے، ارد گرد کی چھتوں پر خواتین کا کوئی اندازہ نہیں، ارد گرد سے لوگ ٹرالیوں ٹریکٹروں پر مشاعرہ سننے آئے ہوئے تھے اور شاعروں کا تو کوئی شمار نہ تھا......رخسانہ نے شب گیارہ بجے کے قریب اپنی باری سے بہت پہلے پڑھنے پر اصرار کیا اور کہا کہ میری فلائٹ ہے اور مجھے جلد نکلنا ہے...... رخسانہ نے مشاعرہ لوٹ لیا، اس شعر پر بڑی حال دہائی ہوئی......

کر لیا ہوتا اگر میں نے زمانے کا یقیں
میرے بچے بھی کسی اور نے پالے ہوتے

رخسانہ کے جاتے ہی مشاعرہ اُجڑ گیا، سامعین ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے اور بقول شخصے صرف شامیانے والے ہی رہ گئے تو میرا نام پکارا گیا کہ ڈاکٹر صاحب اب حفظِ مراتب کے مطابق آپ کی باری ہے......میں نے کہا خبردار! میں اپنی گاڑی میں سکون سے لیٹا ہوا ہوں، کوئی مجھے اُٹھانے کی جرأت نہ کرے......

گوجرانوالہ میں میاں میر فاؤنڈیشن کا اجلاس تھا...... انڈیا جانے کا پروگرام بن رہا تھا...... مولانا کدھر ہیں؟ جی ابھی راولپنڈی سے نکلا ہوں، ارشد معراج میرے ساتھ ہیں......میں نرگس آپا کے ساتھ لاہور سے آتی ہوں......نرگس آپا میں واپسی پر سیاسی لوگوں کے بجائے اپنے رشتہ داروں، ادیبوں شاعروں کے ساتھ جاؤں گی......بہت سے پلان بنے کہ انڈیا میں وہاں وہاں جانا ہے، فلاں فلاں سے ملنا ہے...... ویزے بھی لگ گئے......لیکن شاید ہمارے نصیب میں کچھ مزید خوبصورت یادیں نہیں تھیں......

مولانا! چلو منیر نیازی کی طرف چلتے ہیں اُن کی مزاج پرسی بھی کر لیں گے اور گپ شپ بھی رہے گی۔ منیر نیازی نے ایک دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا...... بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں، شاعری کی باتیں، محبتوں کی باتیں، رنجشوں کی باتیں، کتابوں کی باتیں اور ہاں ادبی تاریخ کی باتیں...... واپسی پر میں نے کہا کہ رخسانہ یہ بابے چند دن کے مہمان ہیں؛ کیوں نہ ہم ان کے ساتھ ایک day long session رکھیں اور ان باتوں کو فلم میں محفوظ کر لیں، اُس نے مجھ سے اتفاق کیا اور ہم نے DVDs بھی خرید لیں لیکن بوجوہ یہ مجلس نہ ہو سکی...... منیر نیازی کی وفات پر یہ قلق میں نے رخسانہ کی آنکھوں میں نہایت گہرا دیکھا......

معروف گائنی کالوجسٹ، ڈاکٹر سلمیٰ سرفراز کے ہاں مشاعرے کے بعد ڈنر پر بڑے عام سے انداز میں میڈم کو بتایا کہ میرا Ca breast کا آپریشن ہوا ہے اور اب کیمو چل رہی ہے۔ ہمارے لیے ایک وحشت ناک خبر تھی لیکن وہ معمول کے لہجے میں باتیں کر رہی تھی......اُس نے کئی سالوں تک اس موذی مرض کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا......

فون کی گھنٹی بجی......مولانا تمہیں خبر نہیں کہ میرا کیا حال ہے؟ میرے مرنے کے بعد ہی آؤ گے؟...... میں ابھی آتا ہوں......نہیں آج مت آؤ، آج کیمو لگی ہے کل تک جی بحال ہو گا کل آؤ، بہت سی باتیں کریں گے......اگلے دن میں بہت سے پھول اور کیک لے کر پہنچا...... بہت سی باتیں ہوئیں...... بہت سا دل دُکھا......لیکن بہت سی باتیں امانت ہیں......اپنے گیتوں کی کتاب کا نسخہ دیا، شاہ مکھی اور گورمکھی رسم الخط میں......اُس کتاب میں میرا بھی کہیں سرسری تذکرہ تھا......

بیٹا گوندی آئی ہے......فیصل ٹاؤن میں یاسر بروسٹ پر لنچ کا پروگرام ہے......تم آسکو گی؟ یا میں pick کر لوں؟ نہیں میں خود آجاؤں گی......آخری لنچ جو ہم نے اکٹھے کیا......آخری یادگار تصویریں......بیٹا، عفت اور سمندر کے ہمراہ......زندگی کتنی مختصر ہے...... یادیں اور بھی مختصر......

سمندر منصوری کا فون آیا......تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے......رخسانہ نور کا انتقال ہو گیا ہے...... ڈاکٹر صاحب اب تمہیں مولانا کہہ کر بلانے والا کوئی نہیں رہا......

جنازے پر حسبِ توقع فلمی دنیا اور ٹی وی کے لوگ زیادہ تھے، ادیب شاعر خال خال تھے...... آغا شاہد، فوزیہ تبسم، محبوب ظفر، ثناء اللہ اور روتی ہوئی صغریٰ صدف کو پرسہ دیا اور کوئی ہمیں وہاں جانتا نہ تھا......منیر نیازی کی تدفین کے موقع پر ایک شعر کہا تھا، وہی بار بار ذہن میں گونج رہا تھا؛

یہ تو سچ ہے کہ تجھے اور کہیں جانا ہے
یہ بھی سچ ہے تری خوشبو نہیں جانے والی

صدق آفریں انتخابِ نعت

ریاض حسین زیدی

الحمدللہ کہ اللہ رب العزت نے نہایت واشگاف اور مستحکم انداز سے محبوبِ رب العلمین کو بہترین تعریف و تحسین کا حقدار ٹھہرایا ہے۔ پھر اپنے مقرب فرشتوں کو اس مدح سرائی میں متواتر سرگرم عمل رہنے کی تلقین کے بعد ہر نوع کی مخلوق کو اس تحریکِ توصیفِ مصطفےٰ ﷺ میں نہایت خشوع و خضوع سے حصہ دار بننے کا حکم صدقِ آفریں دیا ہے۔ گویا محبوبِ کبریا کو دل کی گہرائیوں سے سراہنا اور اس مایۂ ناز ثنا خوانی کو ولولہ انگیز پیرائے میں توسیع بخشنا اور اس کے فروغ و اشاعت میں اپنی بہترین خوبیوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ایمان کی صحیح پہچان ہے اور اس کو انشراحِ صدر سے تسلیمِ جاں بنانا مسلمان کا فرضِ اوّلین ہے۔ "رفعنا لك ذكرك" نویدِ سرنامۂ حیات ہے۔ چنانچہ ہر عہد میں یہ ذکرِ بلند نئے ساز و سامان، نئے انداز، نئے پیرائے، نئے قرینے، نئے ہنر، نئے جوہر، نئے رنگ اور نئے آہنگ سے جلوہ گر ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ اس کی خوشنما شکلیں اور خوبرو صورتیں روزِ ابد تک رونما ہوتی رہیں گی۔ ہر نعت خوشبو سے مالا مال اور اس کا مفہوم طہارت افزا ہوتا ہے۔

قابلِ مبارک باد ہیں وہ افرادِ خوش ذوق، خوش فہم اور ہنر شناس جو اپنے ذوقِ نعت کی تمام تر خوبصورتیوں کو خود بھی تخلیق کرتے ہیں اور جو نعت کہنے کو ہنر آزما خوبیوں سے مزین ہیں، ان کے نعت آفریں تخلیق پاروں کو مرتب کرنے کا شوقِ ثنائے سرورِ کونین ارزانی رکھتے ہیں۔ الحمدللہ کہ یہ ذوقِ انتخابِ نعت ہر عہد میں اپنے اپنے انداز میں جاری و ساری رہتا ہے۔ علی رضا ان منتخبینِ نعت میں اس لحاظ سے منفرد حیثیت کے حامل ہیں کہ وہ خود بھی نعت گوئی اور نعت خوانی کی خوبصورتیوں پر محیط ہیں۔ ان کا معتبر اور منفرد نعتیہ مجموعہ "ثنائے سرور" منصۂ شہود پر آ چکا ہے جسے بجا طور پر وفاقی اور صوبائی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا اور نعت پسند حلقوں میں جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہے۔ اس پر حسنِ مستزاد یہ کہ آپ نے عالمی سطح پر نعت خوانی کا بہترین مظاہرہ کیا اور نعت کی ترنم ریزیوں کا ہر مقام پر لوہا منوایا۔ انہوں نے "درود اُنؐ پر سلام اُنؐ پر" کے عنوانِ روح پرور کے تحت اپنے حسنِ ذوق کی موزوں آبیاری کرتے ہوئے درجنوں نعت گو حضرات کے نعت پاروں کو انتخاب کرنے کا اعزاز پایا ہے۔ وہ اب خوبصورت اضافوں اور حسن آفرینیوں کے ساتھ اس کا نیا ایڈیشن لانے اور نعت پسند ایمان والوں کی بشاشتوں کو مزید رونق افروز کر رہے ہیں۔

میں "درود اُنؐ پر سلام اُنؐ پر" کی اشاعت نو پر علی رضا کو فروغِ نعت کی کوششوں کو صدق دلانہ خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ اللہ رب العزت ان کی یہ کاوشیں بارگہِ مصطفوی ﷺ میں شرف سرفرازی پائیں (آمین)۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

خالق آرزو: شکستِ آرزو کا نغمہ گر

محمد افتخار شفیع

ساہیوال شہر شاہتوں اور سرسبز راستوں کا شہر ہے۔ یہ ایک دھیمے مزاج کا "سویا ہوا محل ہے"، جہاں راتیں اکثر اپنے شبستانوں میں خراٹے بھرتی ہیں، اور دن ٹیرس پر بیٹھ کر سردیوں کی دھوپ سینکتے اور کافی کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہیں۔ ساکنانِ شہر، جیون کی تلخیوں سے نا آشنا بے خبری کے فٹ پاتھ پر اوندھے منہ پڑے رہتے ہیں۔ شہرِ غم کی فصیلوں پر بے رُخی کی جتنی بارشیں ہو جائیں، قدیم تعلقات اور رفاقتوں پر مفاد پرستی کا جتنا بھی کہرا جم جائے، شہر کا دل موم نہیں ہوتا۔ شہر میں یہ اوسط درجے کا علمی ماحول اپنی جگہ گرد و نواح کی آبادیوں میں علم و دانش سے محروم انسان اور اپنے ہی ہم جنسوں کی ستم ظریفیوں کا شکار اپنی اپنی قسمت پر قانع ہے۔ عقیدوں کے سیاہ عفریت مرے شہر کے چراغوں کی لوؤں کو نگل رہے ہیں۔ یہ ہمہ وقت بد صورتوں کا دور ہے۔

ایسے میں شاعر، نغمہ گر، مغنی اور فن کار حالات سے متصادم رہتے ہیں۔ معاشرہ شاعری کے کارِ بے کاراں سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے، شاعر کے ہاں الوہی نغمے ضرور گونجتے ہیں۔ شاعر سماج کی بنائی ہوئی فرسودہ رسموں کا استرداد کرتا ہے۔ اس کا چراغِ فکر مسلسل جلتا ہے۔ اس ماحول میں یہ شاعر اپنا ٹمٹماتا چراغ لے کر آئے ہیں۔ یہ روشنی کرے نہ کرے، اندھیروں کا نقصان ضرور کرے گا۔

خالق آرزو شاعری کی دنیا میں بالکل نو وارد نہیں۔ یوں عرصہ پہلے انہوں نے ساہیوال کی ایک متمدن نواحی بستی سے سفر کا آغاز کیا، خدمتِ خلق کا جذبہ بھی ہم راہ رہا۔ اخباروں اور رسالوں سے منسلک رہے۔ اربابِ علم و دانش سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے بے قراری کو قرار اس وقت آیا جب انہیں استاد الاسید جعفر شیرازی کی رونمائی میسر آئی۔ ہمارے شاعر مسافر بن کر نگری نگری پھرے، دیس بدیس کی خاک چھانی لیکن بہ قول ابنِ انشا: "سفر میں انہیں ہمیشہ ایک بدیسی خطرہ ہی نظر آیا۔" چورڈاکو تو زندگی میں بہت آئے، ایک دو نے تو صبر و قرار بھی لوٹ لیا لیکن مجال ہے جو ان کے ماتھے پر شکن آئی ہو۔ آرزو کی شاعری بھی شکستِ آرزو کا دوسرا عکس اور روپ ہے۔ اس میں شکست کے ساتھ ساتھ ملال بھی نمایاں ہے۔ غزل کے چند اشعار دیکھیں:

اس سے بات کرنا تو یوں لگا مجھے، جیسے
بیچ میں پہاڑوں کے راستہ بنانا ہے

....

ہر بات میں مزہ وہ کہاں شعر گوئی کا
تم سے بچھڑ کے اپنے تو یہ بھی ہنر گئے

....

ڈھلتی اداس شام کے اس پیلے ہاتھ سے
چھلکا جو آفتاب تو میں سوچنے لگا

....

زندگی تجھ سے جو پہلے تھی وہی ہے اب تک
اک اذیت مری قسمت میں لکھی ہے اب تک

....

جدا ہو کر بھی ہوں زندہ ابھی تک
مجھے تو خود پہ حیرانی بہت ہے

خالق آرزو کی شاعری "گل نشتر" ہے۔ اس میں سنگ ریزے ہیں تو کہیں جواہر پارے ہیں۔ اگر کانٹے بھی ہیں تو خوشبو میں بسے ہوئے ہیں۔ یہ کانٹے وہ ہیں جو اس نے راستوں سے چلتے چلتے اپنے کوٹ کے کالر میں ٹانک لیے ہیں تا کہ کوئی اور ان سے زخمی نہ ہو جائے۔ آرزو صاحب شعر و سخن کی دیوی پر تو دو دہائیاں پہلے فریفتہ ہو گئے تھے لیکن کسی اور سمت نکل جانے کے سبب اس کے درشن سے محروم ہوتے ہوتے رہ گئے۔ اب ایک عرصہ بعد مجھے ان کی مراجعت اچھی لگی۔ پیشِ نظر مجموعۂ شاعری میں دیکھیے کس طرح میری بات کی تائید موجود ہے:

ذات تیری تھی خوشبو ایسی
جس کے سنگ
طرح طرح کے رنگ
وادی وادی گزری، جیسے گزری ہوا کا جھونکا
حرفوں کی نگری میں تو نے سب کو دیا چونکا
جیون کے جذبوں کا کتنا تجھ پر ہوا نزول
غزل سراپا ناز ہے تیری، شعر مہکتے پھول
کیا جانے یہ خون میں لت پت، سڑک پہ اُڑتی دھول

میری خواہش ہے کہ ہمارے شاعر کی زندگی میں محبت، امید اور نمو کے دریاؤں کے خوشبو مہکتی رہے۔ ان کا سفر جاری ہے۔ وہ آنے والے اَن دیکھے دنوں میں آفتاب و مہتاب ہیں۔ ان کا دل حیرت کدہ آنکھیں یوں ہی نیم خوابیدہ رہیں:

گردوں گرفتہ دارو گر چشم تو کشاید

جعفر حسن مبارک کا سفرنامہ ''دریا سے صحرا تک''

دستگیر شہزاد

جعفر حسن مبارک کے ذہن میں نئے خیال کا یوں اتر جانا جیسے فضا میں برف کے گالے اڑتے ہیں۔ لفظوں کا جعفر حسن مبارک کے قلم کی نوک سے کاغذ پر اتر جانا، جیسے پھولوں پر شبنم چھلکتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ کیونکر ہے؟ کہاں سے آتا ہے؟ کوئی خیال اور خیال کو لفظوں میں خوشبو کی طرح بسانے کے لیے جعفر حسن مبارک کی انگلیوں میں وہ جادوئی چھڑی کہاں سے آجاتی ہے۔ جو سفید کاغذ پر لفظوں کے گل بوٹے کاڑھتی ہے، جو دریا سے صحرا تک پھدکتے مینڈکوں کو گھوڑوں کا روپ دے دیتا ہے، چڑیوں، طوطوں، اور بگلوں سے باتیں کراتا ہے۔ اور جیتی جاگتی شہزادیاں اور شہزادے پتھر کے ہو جاتے ہیں، لفظوں کی یہ کنچن مالا انگلیاں کیسے پروتی ہیں، آخر کیسے؟

جعفر حسن مبارک کی پہچان اُن کی تخلیقات ''میں نے نشہ چھوڑ دیا'' ''علم المعنیات'' ''سحر قریب ہے'' ''نئے دنوں کے خواب'' اور ''دریا سے صحرا'' تک میں بنیادی طور پر انہماک کی کارروائی ہے۔ یہ انہماک (CONCENTRATION) ان کی تخلیقی روکا پتہ دیتا ہے۔

جعفر حسن مبارک کے سفر نامہ ''دریا سے صحرا تک'' پر لکھنا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ اُن تخلیقی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ سفر نامہ نگار ہیں، شاعر ہیں، نثر نگار ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر نظریاتی لحاظ سے کمیٹڈ آدمی ہیں۔ کمیٹڈ ہونے کے ناطے سماج کے کمزور اور پچھڑے ہوئے طبقے کے دکھوں کا نہ صرف درد رکھتے ہیں۔ بلکہ اُن کے حمایتی بھی ہیں، ''دریا سے صحرا تک'' میں جعفر حسن مبارک کا شاید ہی کوئی ایسا دوست ہو جس کا تذکرہ کسی نہ کسی حوالے سے اس سفر نامے میں موجود نہ ہو۔ جعفر حسن مبارک نے دیارِ غیر میں نہ صرف انہیں ڈھونڈ نکالا بلکہ پہچان بھی لیا۔ سفر کے ابتدائی مراحل میں دوستوں کی محبتوں کے مزاحیہ فقروں نے نکھار پیدا کر دیا۔ زندگی کے مشاہدہ پر مصنف کی مضبوط گرفت نے سفر نامہ میں جان ڈال دی۔ اول تا آخر سفر نامہ میں جذبۂ حب الوطنی بدن میں گردش کرتے ہوئے لہو کی مانند نظر آتا ہے ذاتی احساسات و تاثرات ہمسفروں کے ادھورے خواب، سفر کے خواہشمندوں کی ناآسودہ خواہشات، احسان فراموشی، ضمیر فروشی، رویوں کی بدقدرتی غرض یہ کہ ظاہری چہروں سے پوشیدہ باطن کے رنگ بھی بہت عمدگی سے سفر نامہ میں پیش کیے گئے ہیں۔ سفر نامہ اس ملک یا شہر کی تاریخی حیثیت بھی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔

مگر جعفر حسن مبارک کے سفر نامہ میں انفرادیت یہی ہے کہ پاکستانیوں کی پاکستان سے عدم دلچسپی بلکہ نفرت میں ڈھلی ناپسندیدگی، مغرب و عرب امارات میں بس جانے کی خواہش میں پاکستان اور یہاں کے طور طریقوں پر کیڑے نکالنے کی عادت کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ پڑھ کر لب خنداں اور پلکیں نم ہو جاتی ہیں۔ سفرنامے سے کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔ شاید آپ بھی اپنے ہمزاد کو پہچان لیں۔ ''عادل منیر سے ملاقات کے حوالے سے مجھے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ دوران گفتگو عادل منیر اپنی ذاتی شاعری سنا کر غالباً خود کو متحدہ عرب امارات کے عصری شعراء کی صف میں ایک قد آور شاعر کے طور پر پینٹ کرنا چاہتا تھا۔ اپنی سی کوشش میں دوران گفتگو اُس نے کہا۔ جناب نمونے کے طور پر اپنے کچھ اشعار عنایت فرمائیے۔ تاکہ آپ کی شعری شباہت میرے سامنے آسکے۔

میں نے کہا، جناب میری شباہت بھی وہی ہے۔ جو غیر شاعرانہ شباہت ہے۔ آپ میری اس شباہت کو میری شعری پہچان کے لیے استعمال میں لائیں۔ اس نے جب دیکھا کہ جعفر حسن مبارک ''غزلو غزلی'' ہونے سے احتراز برت رہا ہے تو مصنوعی ناراضی سے بولا۔ اچھا تو پھر میں بھی آپ کو اپنی غزل نہیں سناؤں گا۔

مجھے محسوس ہوا اپنی مصنوعی ناراضی سے وہ مجھے یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ یار اگر اپنی غزل نہیں سنائی۔۔۔ نہ سناؤ۔۔۔ جاؤ بھاڑ میں۔۔۔ مگر کم از کم میری غزل تو سُن لو۔

تھوڑی دیر بعد احمد سرفراز اپنی بیماری سے باہر آچکا تھا۔ اور پھر احمد سرفراز نے پانچ سات منٹ میں خود کو بتا دیا کہ وہ کیا ہے۔ کالج لائف سے لیکر تا حال اُس کا یہی دستور چلا آرہا ہے کہ وہ اپنی معلومات کے ذریعے اپنے مخاطب کے حواس پر چھا جانا چاہتا ہے۔ اور اُس کی معلومات کی نوعیت ایسی ہوتی ہے۔ کہ عام حالات میں وہ کسی خاص کام کی بھی نہیں ہوتی۔ مثلاً عام آدمی کو اس سے کیا غرض ہو سکتی ہے کہ سخت محنت کرنے والے ایک بالغ مرد کو روزانہ چار گیلن تک پسینہ آسکتا ہے۔ یا یہ کہ بکریوں کے اوپر کے سامنے کے دانت نہیں ہوتے۔

میں شیخ مجیب الرحمٰن ہوں۔۔۔ بھوپال والا۔

یاد نہیں اُس وقت پہلی ملاقات پر آپ نے میرا نام سُن کر مجھے کیا فرمایا تھا؟ یاد آیا حضور کو؟ چلیئے میں یاد دلائے دیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کا نام سُن کر مجھے مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بننا یاد آگیا ہے۔

حضور میں وہی شیخ مجیب الرحمٰن ہوں۔۔۔ بھوپال والا۔

وہاں مقیم لوگوں سے تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

آپ کا اسم گرامی؟ جواب میں بتا بھی دوں تو آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ نام کا اپنا ایک دھوکا ہوا کرتا ہے۔ مثلاً کیا آپ کو علم ہے کہ آج جسے آپ بنک آف امریکہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کبھی اس کا اصل نام بنک آف اٹلی تھا۔ جناب آپ کا نام جاننے کی استدعا کا مقصد میری طرف سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں تھی۔

بالکل بالکل! یونہی تو میں کہنا چاہ رہا تھا، اگر میں آپ کو فی الوقت یہ بتا بھی دوں کہ بوئنگ ۷۴۷ ایئر لائنز میں ۵۷،۲۸۵ گیلن ایندھن ہوتا ہے۔ تو آپ کو اس سے کیا ملے گا۔

سر میں نے وضع داری کے تقاضے کے پیش نظر آپ کا اسم گرامی دریافت کیا تھا۔

بجا فرمایا۔ آپ نے وضع داری کے تقاضے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص کھانا کھاتے ہوئے تقریباً ۲۹۵ مرتبہ خوراک نگلتا ہے۔ تو بھائی صاحب یہ تقاضے نہ چاہتے ہوئے بھی پورے کرنے پڑتے ہیں۔

اچھا صاحب اگر آپ اپنا نام نامی پردہ اخفاء میں رکھنا ہی چاہتے ہیں۔ تو میں بھلا اس کے انکشاف پر آپ کو مجبور کرنے والا کون ہوتا ہوں؟

حضور بات یہ ہے کہ پرندے اپنے معدے کے ذریعے خوراک چباتے ہیں، خوراک چبانے کے لیے وہ اپنی چونچ کو زیادہ زحمت نہیں دیتے۔۔۔ میں عموماً کوشش کرتا ہوں کہ گفتگو کے دسترخوان پر اپنی چونچ کو کم سے کم زحمت دوں۔ لیکن آپ مایوس نہ ہوں۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ ۹۰ فیصد ریسٹورنٹ اپنے قیام کے پہلے سال ہی ناکام ہو جاتے ہیں۔ کامیابی انہی کے حصے میں آتی ہے جو اپنی کوشش جاری رکھتے ہیں۔

آج کے تجارتی دور میں ہر شے کی اہمیت بازار کے اتار چڑھاؤ سے طے ہوتی ہے بدلتے ہوئے وقت کی تیز رفتاری، زندگی کے مختلف شعبوں کی طرح ادب کے افہام وتفہیم میں بھی داخل ہوتی جارہی ہے۔ بازار کی ضرورت جیسی بھی ہو ادب کی صورت بھی ویسی ہو۔ اس رویے نے ادب کی تخلیقی انفرادیت چھین کر اسے مشینی اجتماعیت کا شکار بنا دیا ہے، ادب کی یہ صورت حال کسی ایک زبان یا علاقے تک محدود نہیں ہے۔ عالمی سطح پر بھی اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کے شور شرابے سے دُور ہو کر جو ادیب وشاعر خود اپنی صحبت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہی ادب میں کوئی نئی جوت جگاتے ہیں۔

جعفر حسن مبارک کے سفر نامے کا مزاج صوفیانہ اور تیور باغیانہ ہے ماضی کی تہذیبی اقدار سے گہرے لگاؤ اور دور حاضر سے شعوری جڑاؤ نے ان کے سفر نامے کو تہہ دار بنا دیا ہے، اور اسے شخصی رنگ وروپ سے بھی سجایا ہے۔

جعفر حسن مبارک کے سفر نامے کی زبان یوں تو بظاہر سیدھی اور صاف ہے۔ لیکن یہ جتنی رواں دواں نظر آتی ہے۔ اتنی ہی گہری اور پُر اثر ہے۔ واقع ہر شخص بیان کر سکتا ہے۔ ہر شخص سفر کا حال نہیں سنا سکتا۔

جعفر حسن مبارک نے نہ صرف وہاں مقیم پاکستانیوں کے دکھ سکھ کو محسوس کیا۔ بلکہ واقعات سے بھی ثابت کیا کہ یہاں کے لوگ جو تہذیب وکلچر میں رنگ گئے ہیں۔ وہ کسی سے مشورہ نہیں کرتے۔ اپنے حاکم آپ ہوتے ہیں۔

دبئی میں ایک محفل کا تذکرہ جعفر حسن مبارک نے بڑی لگن سے کیا ہے۔

اپسراؤں کا سامنے پا کر تو احمد ندیم قاسمی بھی کہہ اٹھے تھے

اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسن انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

میں تو ٹھہرا ایک معمولی آدمی قاسمی صاحب کے شعری مضمون سے پریرنا پا کر میں بھی حسن انسان سے نمٹنے کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔ اسی پریرنا سے حوصلہ پا کر میں نے تین کی ٹولی میں شامل ایک سراپا غزل عفت مآب بی بی کی طرف سرسری سی نظر اٹھائی کہ اس نے جوابی طور پر فوراً آنکھ ماری۔ میرا اپنے پورے سابقہ کیریئر میں ایسی ٹچی بی بی سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میری پیشانی پر پسینہ آگیا۔ جی میں آئی کہ فوراً اس بی بی کے پاس جاؤں اور اس سے پوچھوں کہ کیا تیرے گھر میں باپ بھائی نہیں ہیں؟

دریا سے صحرا تک پڑھنے کے بعد ایسا لگا جیسے سفر نامہ مجھ سے باتیں کرنے لگا ہو، کیسے سچے لفظ ہیں۔ بعض لوگ اپنے قلم سے لفظوں کو قتل کرتے ہیں۔ جعفر حسن مبارک نے لفظوں اور جذبوں کو ملا کر ایک نئی دنیا بسا دی ہے، چپ شبدوں کو زبان دے دی ہے، اور زبان بھی ایسی جیسے دل کو کوئی نرم پرتوں سے چھو رہا ہو، دریا سے صحرا تک کے صفحات بعد ہی ختم ہو جائیں۔ ایسے سفر چلتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتے۔

''دریا سے صحرا تک'' ایک ایسا سفر نامہ ہے۔ جس میں تحقیق وتخلیق کی آمیزش نے نکھار پیدا کر دیا۔ اور اس کے علاوہ محض دبئی کی جغرافیائی ساخت کا نقشہ نہیں کھینچا، تاریخی واقعات پر اکتفا نہ کیا، بلکہ حالیہ تہذیب وتمدن اور رہن سہن کے حوالے سے لکھا اور خوب لکھا۔

قصہ مختصر! میں جعفر حسن مبارک کا مداح ہوں۔ اُن کا خیر خواہ ہوں۔ اس لیے اُن کے کان میں دو جملے کہوں گا۔

پہلا جملہ: تیری تحریر میں بانکپن ہے، اس کے علاوہ کچھ نہ سمجھنا

دوسرا جملہ: تیری شخصیت من موہنی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہ سمجھنا

غالباً یہی دو جملے بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان نے چراغ حسن حسرت، مولانا عبدالمجید سالک اور حمید نظامی کے کان میں کہے تھے۔

اقرار مصطفیٰ...... ''اقرار'' کے آئینہ میں

احسن ریاض/کمالیہ

اہل ادب کے نزدیک شاعری ''غالب'' پر پہنچ کر اپنی کاملیت کے مراحل درجہ بدرجہ طے کرتی ہوئی رنگا رنگ مضامین اور خیال آفرینی کے اوج ثریا پر ناز وادا سے براجمان ہوجاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''غالب'' کے بعد حضرات محض تسکین طبع کے واسطے سخن سرائی کرتے رہے، کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے وگرنہ شاید ہی کوئی خیال یا مشاہدہ ایسا ہو جو ''غالب'' کی قادرالکلامی کی دسترس سے باہر رہا ہو۔ حقیقتاً اس میں کوئی شک نہیں کہ دیوان غالب اپنے اندر بیش بہا گنجینۂ معنی سموئے ہوئے ہے۔ لیکن کائنات اور اس کے راز ہر انسان پر جو غور وفکر اور مشاہدے کی کسوٹی پر روزمرہ معمولات کو جانچتا ہے۔ الگ الگ طرح سے کھلتے ہیں۔ یقیناً ''غالب'' بھی اس کو فن کاری اور استادی مانتے ہوں کہ پرانے خیالات کو بھی اس ڈھنگ سے بیان کر دیا جائے کہ وہ اپنے اندر ایک تازگی اور شگفتگی لیے ہوئے ہوں اور قاری یا سامع پر ایک الگ سا تاثر قائم کر دیں۔ شاعری کی اب تک کوئی واضح اور خاطر خواہ تعریف پیش نہیں کی جا سکی اور کی بھی گئی تو صاحب علم حضرات اور ادب کی ذی شان ہستیوں کی طرف سے کی گئی تعریفوں کے ملبے تلے دب کر مبہم اور غیر واضح ہو گئی۔ شاعری کو جس مرضی انداز میں بیان کر لیں اس کی ایک قدر ''محمد تقی میر سے لے کر اسد اللہ خان غالب، غالب سے لے مرزا داغ دہلوی، داغ سے لے کر علامہ محمد اقبال، اقبال سے لیکر فیض احمد فیض، فیض سے لے کر شکیب جلالی، شکیب سے لے کر ظفر اقبال تک مشترک رہی ہے اور یہ مشترکہ قدر ''ذریعہ عزت اور توقیر اور ذات کے اظہار کا بیانیہ ہے'' اساتذہ مختلف طرح سے بلکہ ہر طرح سے شاعری کو بیان کر چکے ہیں۔ ایسے میں اگر ادب کا کوئی طالب علم اور اساتذہ کی قدم بوسی کرتے ہوئے نہایت عاجزی اور نپے تلے الفاظ میں یہ کہہ دے کہ ''ادب کے طالب علم کی حیثیت سے شاعری اور اس کے کلچر کے حوالے سے مختلف اور متعدد مضامین اور مباحث سے اکتساب کرتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاعری اور اس کا کلچر توفیق، تنہائی اور خیر کا استعارہ ہے۔ یعنی اپنے حصہ میں آئی ہوئی توفیق اور تنہائی کو بروئے کار لاتے ہوئے خیر کو منظوم کرنا شاعری کہلاتا ہے'' تو میرا یقین ہے اساتذہ اس طالب علم کو لازماً دعائیں دیں گے اور شاعری کی اس نیک اور خوب صورت الفاظ میں کی گئی واضح تعریف کو قابل آفرین وتحسین قرار دیں گے اور سر دھنتے جائیں گے۔ مزید یہ طالب علم اپنی ذہانت ولیاقت اور دور اندیشی کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی کتاب کے سر ورق کو یوں ترتیب دے کہ اُس کو دیکھنے والے دو صدیاں پیچھے سفر کرتے ہوئے غالب کے منہ سے یہ جملے ادا ہوتے سنیں ''بھئی! میرا سارا دیوان لے لیں، یہ شعر مجھے دے دیں''۔ اس جملہ خوش کن کو سن کر یہ طالب علم دست بستہ غالب کے پاس جاتا ہے اور مرشد کی دست بوسی کرتا اور ان کے سماعت کے نظر میں ایک شعر کر دیتا ہے۔

میں تو غالب نہیں اقرار ہوں سب جانتے ہیں
کس لیے چپ ہو کہ مصرع تو اُٹھاؤ میرا

غالب انانیت کا یہ رنگ دیکھ کر جھومے بغیر نہ رہ سکے اور ان کا یہ جھومنا بڑی ہشیاری سے کینوس پر اتار لیا جاتا ہے۔ اور ''اقرار'' کے سرورق یوں سجا دیا جاتا ہے گویا غالب جھوم کر اقرار کر رہے ہوں۔ اب کسی کو یہ جلال الدین رومی جھومتے محسوس ہوں یا محمد تقی میر یا پھر غالب۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جھوم کر وہ اقرار کیا جاتا ہے جو عالم ارواح میں لے لیا گیا تھا اور جس اقرار کے بغیر کائناتوں کے وجود ادھورے ہیں۔ جی ہاں! میں اقرار مصطفیٰ کے ''اقرار'' کی بابت سخن آراہ ہوں جس کو وہ شاعری میں ڈھال کر ''قرار'' کا نام دے کر منصۂ شہود پر لے آئے۔ یہ وہی اقرار مصطفیٰ ہیں جو غالب کو اپنا مرشد مانتے ہیں اور برملا اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہی وہ اقرار مصطفیٰ ہیں جن کے بارے جدید اردو ادب کے دو معتبر نقاد اور ان کی شاعری کی بابت آراء دینے والے حضرات نے لکھا ہے کہ دورِ حاضر کے دو جدید شعراء جون ایلیا اور فراق گھورکھ پوری اقرار مصطفیٰ کے ہاں بہم آمیز ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وہ اقرار مصطفیٰ ہیں جو اپنا تعارف یوں کراتے ہیں۔

وہ جس کو کہتی ہے اقرار مصطفیٰ دنیا
وہی ہوں میں یہ تعارف ہے مختصر میرا

اقرار مصطفیٰ کے تعارف کے بعد میں ''اقرار'' کی بابت کچھ کہنا چاہتا ہوں جو مجھے اس کتاب کے مطالعہ کے

بعد اپنے تئیں اخذ کرنے کو ملا۔ کتب کے صفحے پر جا کر انتساب نظر آتا ہے جو کہ منظوم ہے۔ یہ شعری مجموعوں کی روایت میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ شاعر انتساب منظوم پیش کرے۔ محسن نقوی کے بعد اقرار کے ہاں بھی یہ روایت پنپتی نظر آئی تو دل باغ باغ ہو گیا۔ مزید برآں انتساب اپنے پورے معنی اور ادا کے ساتھ آپ کو ملتا ہے اور آپ کو ان کے فلسفہ شاعری اور اس کے خاص رنگ سے واقف کرواتا ہوا نظر آتا ہے۔ آج کا دور جس میں کتاب ایک کتابچے کی شکل اختیار کر چکی ہے میں ۲۴۸ صفحات پر مشتمل شعری مجموعہ تحسین کن ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انتخاب میں بھی تصوفانہ فلسفہ برتا گیا ہے مثلاً حمد اور نعت سمیت غزلیات کی تعداد ۹۹ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ننانوے صفاتی نام کے فلسفہ کی غمازی ہے اور حمد اور نعت سمیت تمام غزلوں کے اشعار کی تعداد طاق رکھی گئی جو فلسفۂ وحدت کے پیش نظر کارفرما نظر آتی ہے۔ اب ایک کام عروضیوں پر چھوڑنا چاہیے کہ وہ پڑھ کر یہ بھی بتائیں کہ اس کتاب میں عروض کا کیا حوالہ ہے؟ شاعر کتنی بحور کے ترازو میں اپنے الفاظ کو تولتا ہے۔ جب کہ آج کل دو چار بحروں سے زیادہ تولنے والا بھی جہنمی ہے اور سوچنے والا بھی جہنمی سمجھا جاتا ہے۔ شاعری اور روایت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بقول اقرار مصطفیٰ انسان روایت سے کٹ کر نہیں جی سکتا البتہ روایت کو تبدیل ضرور کیا جا سکتا ہے۔ روایت میں اسی تبدیلی کی کوشش ''اقرار'' میں جا بہ جا بینائی کے گوشوں سے راستہ بناتی ہوئی لاشعور کی گھاٹیوں میں اترتی چڑھتی سیر کرتی ہے۔ اقرار مصطفیٰ غم جاناں اور غم دوراں کے سوا بھی کچھ سینے میں لیے پھرتے ہیں۔ جو انہیں ادراک و آگہی کے لیے لازم نظر آتا ہے۔

دنیا کا نہ دیں کا نہ کسی اور کا غم ہے
اک درد ہے سینے میں نہاں اور طرح کا

میں اقرار مصطفیٰ کو تب سے جانتا ہوں جب میں بہت چھوٹا اور وہ بڑے دانا تھے۔ درجہ بدرجہ سیکھتے ہوئے بھی میں قد نہ بڑھا سکا جب کہ وہ قد آور ہوتے گئے۔ ان کے بارے کچھ لکھنا یا بولنا میری حیثیت سے بڑھ کر ہے لیکن جسارت کر رہا ہوں تو یہ سوچ کر کہ نہ لفظی صنائع کاری ہے اور نہ ہی پیچیدہ جملوں کا جال پھیلا کر سامنے والے کے دماغ کو دام اسیری میں الجھاتا ہے۔ نہ ہی پیش نظر استاد کے قصیدے لکھنا ہے جو کہ اردو ادب کی روایت کا اٹوٹ حصہ ہے جس کے نمونہ جات ہر بڑی اور چھوٹی لائبریری کی زینت ہوتے ہیں اور نہ ہی مقصود اپنی ذات کا اظہار ہے۔ کچھ ہے تو بس روشنی کا ایک ''دیا'' جو ''اقرار'' کی صورت آپ حضرات تک پہنچاتا ہے تاکہ اس اجالے کی موجودگی میں ہم پورے ہوش و حواس میں ''الست بربکم، قالو بلیٰ'' یاد کر کے اقرار مصطفیٰ کی آواز سے آواز ملا کر ''اقرار'' کی معیت میں کچھ سفر طے کریں:

اقرار میں بھی کرتا نہ کیوں اس کی ذات کا
ہر روپ میں عیاں تھا خدا میرے سامنے

....

خود کو جب چاک پہ دھرا اقرار
پھر زمانوں کے گرد گردش کی

جیسا کہ قبیلہ ادب کے تمام گروہ کو بہ نفس نفیس اس کا ادراک ہے کہ شاعری متضاد کیفیات و خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس قبیلہ کا ایک فرد ہونے کے ناطے اقرار مصطفیٰ بھی خود کو اس کا پاسدار پاتے ہیں۔ ان کے ہاں انانیت، شکایت، سوز و گداز، فلسفہ، تلمیحات، تشبیہ و استعارہ کا جائز اور مناسب استعمال، آگہی اور اس کے کرب کا بیان، تغزل کا رنگ اور لوق، تراکیب کا استعمال، محبوب سے باتیں اور سب سے بڑی بات جو شاعر کا فرض اولیں ہوتی ہے امید کا دامن وہ چھوٹنے نہیں دیتے۔ اندھیروں کے اندر نہیں بھٹکتے، اپنی اعلیٰ سطحوں پر پائی جاتی ہے۔ اس سب کے باوجود ان کا مخصوص انداز جس میں خدا، انسان اور کائنات کی مثلث بنتی ہے وہ اس کے کہیں بھی بالائے طاق نہیں رکھتے۔ ان کی ان متضاد کیفیات کے سلسلہ میں چند اشعار آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

اٹھانا جام تھا اقرار لیکن
غرور سر اٹھا کر آ گئے ہیں

ایک تم ہی تو تھے میرے اپنے
بات تم بھی سمجھ نہیں پائے

کیسا لگوں گا خود کو یہی سوچتا ہوں میں
جس جس نے مجھ کو جو ہے پکارا بناؤں گا

عرصہ گاہ زماں میں کیا ہے
اور زمیں آسماں میں کیا ہے

دیکھنے کو تو اسے بار نہیں ہے مجھ کو
بات یہ ہے کہ برابر نہیں دیکھا جاتا

تیرا اقرار ہی تو ہے بے شک
روبرو اور کو بکو مجھ میں

کیسے مردہ ضمیر لوگوں میں
زندہ رہنے کی ہم نے کوشش کی

اقرار مصطفیٰ ''اقرار'' میں اپنے حرف اعتراف کے پہلے ہی پیراگراف میں یہ بتاتے ہیں کہ ''مجھے اب یاد پڑتا ہے کہ میں ابھی کسی بھی صورت کو پہچاننے کے عمل سے کوسوں دور تھا کہ میری والدہ محترمہ اس جہان فانی سے ملک عدم سدھار

گئیں مزید یہ بھی لکھتے ہیں کہ "یعنی پہچان کے عمل میں، میں نے تنہائی کو پہچانا جسے ماں کا استعارہ خیال کرتا ہوں۔" اس سے ظاہر ہے کہ وہ والدہ کے سایۂ شفقت سے بہت چھوٹی عمر میں محروم ہوگئے لیکن رب تعالیٰ کی ذات اپنے بندوں پر اپنے احسانات کی بارش برساتی رہتی ہے۔ خود اقرار مصطفیٰ ہی حرفِ اعتراز میں لکھتے ہیں کہ ان کے والد نے ان کے لیے ماں کی کمی کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن ماں کا نعم البدل اپنی اولاد کے لیے نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اقرار مصطفیٰ کو ایک ماں سے جدا کیا تو بہت سی ماؤں سے ملوا دیا۔ ان کے والد کی بہنیں اور ماں کی بہنیں سب ماں سے بڑھ کر انہیں لاڈ کرتی ہیں اور ان کے احباب کی مائیں انہیں اپنا بیٹا مانتی ہیں جو یقیناً خداوند کریم کا ان پر خاص کرم ہے لیکن کوئی اقرار مصطفیٰ کے دل و دماغ سے اس احساسِ محرومی کو کیسے مٹائے؟ وہ خود کہتے ہیں

ماں تُو بھی جا کے موت کے پہلو میں سو گئی
اب کون دے گا مجھ کو دعا میرے سامنے

"بشریت کے تقاضے ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں اور ہم اُن کے ہاتھوں مجبور بھی ہو جاتے ہیں۔ ویسے تو اقرار مصطفیٰ نے کبھی کسی چیز کو زندگی میں عادت نہیں بنایا لیکن کچھ چیزیں ہیں جو وہ اب تک اپنائے ہوئے ہیں اور ان میں سے بھی دو چیزیں ایسی ہیں جن سے وہ چاہ کر بھی دامن نہیں چھڑا سکتا۔ پہلی جسے وہ اپنی محبوبہ کہتے ہیں یعنی غزل۔ اقرار مصطفیٰ جب غزل سے باتیں کرتے ہیں تو کسی اور سے نہیں کرتے۔ جب غزل اپنی چوڑیاں کھنکاتی ہوئی انہیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے تو بھری محفل میں اُس کے لیے اپنے آپ کو یوں وقف کر دیتے ہیں کہ اہلِ محفل کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی اور بالفرض محال خبر ہو بھی جائے تو ان کی بلا سے ہوتی رہے۔ دوسری وہ جسے میں ان کی محبوبہ کہتا ہوں یعنی تبسم ـــــ جی ہاں اقرار مصطفیٰ تبسم کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ حالات جو بھی ہوں لیکن اقرار مصطفیٰ لبوں پر ہنسی سجائے رہتے ہیں اور دوسروں کو ہنساتے رہتے ہیں۔ ان کے مطابق دوسروں کے ساتھ اخلاق اور مروت سے پیش آنا انسان کا فرضِ اولین ہے۔ اگر آپ کسی سے ملتے ہیں تو کسی سے ملتے ہیں تو کچھ معیاری لمحے گزارنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے دکھ درد اور آزار تو ساتھ ہی رہتے ہیں دوسروں کا کیا قصور ہے؟ اللہ رب العزت ان کو یوں ہی مسکراتا رکھیں اور وہ مسکراہٹیں بانٹتے رہیں۔ آمین

محبت کو زندگی میں خاص اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانیت کا رشتہ بہت عظیم ہے۔ اور ان کے نزدیک یہ احساس کسی ایک انسان تک محدود ہو کر نہیں رہ جانا چاہیے بلکہ آپ کی ذات تمام لوگوں کے لیے خیر کا باعث ہونی چاہیے اور آپ کے لیے سب ہی خاص ہونے چاہئیں۔ وہ خود اس کا اعلان بھی کرتے ہیں۔

ہاں! جہاں تک بھی ہو سکا ممکن
میں نے انسان سے محبت کی

....

وقت کا کیا ہے کسی طور گزر جائے گا
کتنا اچھا ہے اگر مل کے گزارا جائے

جہاں تک میں ذاتی طور پر اقرار مصطفیٰ کو جانتا ہوں ان کی شاعری ان کی شخصیت کا پرتو نظر آتی ہے۔ وہ شاعر تو خوب صورت ہیں ایک انسان بھی بہت خوبصورت ہیں۔ ایک مخلص دوست، ایک شفیق استاد (جو وقت آنے پر کسی سزا سے بھی دریغ نہیں کرتا)، مہرباں ساتھی اور محبت بانٹنے والے انسان ہیں۔ غالب کے بارے مشہور ہے کہ ان کی بیوی (امراؤ بیگم) بہت نفیس الطبع اور شستہ برتاؤ عورت تھیں۔ ورنہ عورت برداشت نہیں کرتی کہ اس کے علاوہ بھی کسی کو وقت دیا جائے۔ اقرار مصطفیٰ بھی اس لحاظ سے طالع قسمت ہیں کہ ان کی بیوی بھی معاون اور ان کی وفادار ہیں۔ ہر حال میں ان کو آسانی فراہم کرتی ہیں۔ اللہ پاک انہیں سلوک کی منزل کا راہی رکھیں۔ آمین۔ اپنی طبیعت اور اپنی خو کو وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

ہے رواں ایک آبِ جُو مجھ میں
کوئی رہتا ہے زم زُو مجھ میں

....

زخم دیتے نہیں ہیں ہم اقرار
باعثِ اندمال ہیں ہم لوگ

جیسا کہ اقرار مصطفیٰ "اقرار" کے حرفِ اعتراز میں بیان کر چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے حصے کی خیر "اقرار" کے حوالے کر دی اور یہی کائنات کا پہلا اور معتبر حوالہ ہے۔ یہی اقرار ان کی ذات اور بیان کا اظہاریہ، انکشافیہ، اعترافیہ اور اقراریہ ہے۔ "اقرار" میرے ہاتھوں میں ہے اور مجھے خوشی اس امر کی ہے کہ اس دور میں بھی خیر میرے ہاتھوں میں ہے۔ میں یہی دعا کرتا ہوں کہ یہ خیر زیادہ سے زیادہ لوگوں کی میسر آئے اور لوگ صدیوں تک اس سے مستفید ہو سکیں۔ جس کو یہ سمجھ آ جائے خدا اسے توفیق دے کہ وہ آگے اس سے فیض یاب کرے اور جو نہ سمجھ پائے اُس کے لیے دعا ہے کہ وہ جلد "اقرار" کے قابل ہو جائے۔ آمین

اقرار مرا سارا سفر سچ کا سفر ہے
کہہ دیتا ہوں جو بات مکرتا نہیں ہوں

محمد نعیم یاد کے "پتھر روتے ہیں"

نازاوکاڑوی/لاہور

مجھے کسی ضروری کام سے گھر رُکنا پڑا۔ میری عدم موجودگی میں عزیزم محمد نعیم یاد ہمراہ دیرینہ شناس سخن دوست محمد علی اسد بھٹی ماہنامہ "ارژنگ" دفتر تشریف لائے میری عدم موجودگی پاکر میرے ساتھ فون پر رابطہ کرکے اپنی آمد کی اطلاع دی اور ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا جو اباً اپنا عذر پیش کیا۔ بھٹی صاحب نے محمد نعیم یاد کا غائبانہ تعارف کرواتے ہوئے اُن کی کُتب "پتھر روتے ہیں" اور نیناں دے سُفنے" مُجھ تک پہنچانے کا کہتے ہوئے ملاقات نہ ہونے اور کُتب دستی نہ وصول کرنے کی معذرت چاہی۔ جوانہوں نے بخوشی قبول کرتے کتابیں ہمسایہ پبلشر کو دیتے ہوئے اجازت چاہی۔

دوسرے دن کتابیں وصول کیں اور حسبِ معمول اپنی لائبریری میں پڑی میز پر رکھیں اور دوسرے ادھورے کام مکمل کرنے میں لگ گیا۔ جونہی ان ناموں سے فرصت ملی تو "پتھر روتے ہیں" کا سرسری جائزہ لینے لگا ورق گردانی کیا کرتا جو بھی ورق پلٹتا اُسے پورا ہی پڑھتا جاتا پڑھنے میں اس قدر میں محو ہوگیا یہ محمد نعیم کی یاد کی تحریر کا اثر تھا کہ مجھے آگے بڑھنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ بہت کم ایسی کُتب دیکھنے اور پڑھنے کو ملتی ہیں کہ ورق گردانی کرتے ہی کتاب کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ لیکن "پتھر روتے ہیں" نے اندازہ لگانے کی مہلت ہی نہ دی کہ جو بھی ورق الٹتا اُسے مکمل ہی پڑھتا اور پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ محمد نعیم نے حرفِ آغاز میں ہی اپنے پڑھنے والوں کے ذہنوں کو تیار کرنے میں بڑی مہارت سے کام لیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے محمد نعیم نا صرف اچھا لکھاری ہے بل کہ قارئین کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عنوانات کو پُر کشش رکھا تو مضامین کی تحریر قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلنے کے فن سے بھی آشنا ہے۔ میں خود بھی اس سحر انگیزی کا شکار ہوا ہوں۔ ایک خوبی اور بھی دیکھنے کو ملی وہ یہ کہ جہاں محمد نعیم مصنف ہے تو موجد سرورق بھی نعیم یاد ہی ہے۔ خوبصورت الفاظ کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب رہا۔ پتھروں کی "آنکھوں سے آنسوؤں کی آبشار نعیم یاد کی اعلیٰ ذوق کی ترجمان ہے۔

آگے چل کر بھارت سے ڈاکٹر عظیم راہی نے نعیم یاد کے اس افسانچی مجموعہ کے لیے جو کچھ بھی لکھا وہ قارئین کی معلومات میں بھی اضافہ کرتا ہے افسانہ اور افسانچہ کی تاریخ اور مختلف معرکتہ الآراء ادباء کی مثالیں دے کر نعیم یاد کی جہاں حوصلہ افزائی کی ہے وہاں نعیم یاد کے اس مجموعہ کو بغور پڑھنے کی طرف راغب کرنے کی کوشش بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں افسانے کی تاریخ تو بہت پرانی ہے اور اس میں خاصا لوگوں نے نام بھی کمایا لیکن افسانچہ لکھنے والوں کے میدان میں ابھی تک معدودے چند نام ہی ہیں۔ حال ہی میں سید اخلاق گیلانی کے افسانچوں کا مجموعہ "ستجانیاں" پڑھنے کو ملا۔ گیلانی صاحب کی اس کوشش کو خاصا سراہا گیا ہے۔ نعیم یاد بھی اس میدان میں سرپٹ دوڑتے نظر آرہے ہیں۔ ابھی نوجوان ہیں خون گرم ہے دماغ زرخیز ہے سب سے بڑھ کر ان کے اندر احساس کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ مشاہدے کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے جذبات و احساسات کی پیوندکاری کرتے جارہا ہے۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیاں ہو فرد و افراد کی جبلیات ہوں یا حکمرانوں کا اپنے سماج سے آنکھیں بند کرتے ہوئے اقرباء پروری ہو یا اپنے حاشیہ برداروں پر نوازشات ہوتی دیکھ نہیں پاتا تو اپنے قلم کو کہیں نشتر تو کہیں کلا شگوف کا سہارا لے کر میدان میں نکلتا ہے اس سے قبل ایک افسانوی مجموعہ "اک خواب جو ٹوٹ گیا" بھی اپنے پڑھنے والوں سے داد تحسین پا چکا ہے۔ اس نوجوانی میں خدا نظر بد سے بچائے آمین! داد و تحسین حاسدوں کو کھٹکتی ہے۔

میں تو یہی کہوں گا "اللہ کرے زورِ حسن اور زیادہ"

اب دیکھتے ہیں نعیم یاد نے "پتھر روتے ہیں" میں کیا لکھا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ اس مجموعہ کا سرورق بھی ہے۔ "پتھر روتے ہیں" پورا افسانہ ایک گاؤں کا منظر پیش کر رہا ہے کردار بھی وہی جو ایک عام گاؤں میں ہوتے ہیں۔ لیکن نعیم یاد نے اس عام واقعے کو اچھی اچھی تحریر اور کرداروں کے مکالموں نے اسے ادبی چاشنی سے لبریز کردیا۔ ہاں! کرداروں کے نام اور ان کے کسبِ معاش کے ذریعوں نے مرحوم منشا یاد کے کرداروں اور ناموں کو زندہ کردیا ہے۔ میں پڑھ رہا تھا میرے ساتھ ساتھ کہیں منشا یاد بھی چلتے ہوئے نظر آئے۔ لیکن ایک بات بھی کھٹکی کہ چارہ کاٹنے والی مشین میں آدمی کا ہاتھ بازو تو آسکتا ہے یا کسی حادثہ کی صورت سر بھی تیز دھار والے بلیڈ کی زد میں آسکتا ہے لیکن دھڑ نہیں۔ شاید کوئی اور مشین ہوگی جو میری نظر

سے نہ گذری ہو۔ ان سطروں پر بھی غور کیا جاسکتا ہے "اس کی شادی کی تیاری تھی اور ایک دن وہ اپنے ڈیرے پر گیا بارش کی وجہ سے پھسلن زیادہ تھی اور اس کا پاؤں پھسلا اور اس کا سر سیدھا مشین کے نیچے"۔۔۔۔۔ ایک تو تکرار لفظی دوسرا وہ یہ کہ سر سیدھا مشین کے نیچے۔ یہاں مشین کی وضاحت نہیں کونسی مشین تھی۔ مشین تو از خود وزنی ہوتی ہے یا پھر حرکت کرتی ہوئی آگے پیچھے چلتی ہے۔ جیسے کوئی کار، بس، لوڈر وغیرہ۔ تکرار لفظی کے ساتھ لفظ اضافت بھی ہے جیسے "اس کی شادی تیار تھی اور ایک دن وہ اپنے ڈیرے پر گیا" اس تحریر میں "اور" اضافت ہے۔

اگلا افسانہ "اب کے بہار آئی"

اس افسانہ میں لا تقنطومن رحمة الله "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں" کو بڑے ہی سلیقے سے صفحۂ قرطاس پہ بکھیرا ہے۔ جہاں قارئین کے لیے دلچسپ ہے وہاں ایک جامع پیغام بھی دینے میں کامیاب رہے ہیں۔

اس افسانہ میں ہر چند پروف کی غلطیاں ہیں لیکن ایسی بھی نہیں کہ کہیں ابہام پیدا ہو جائے۔ قاری از خود پروف کی غلطی ہی تصور کرے گا۔ یہی نعیم یاد کے انداز تحریر کا کمال ہے۔ نعیم یاد ابھی طالب علم ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہاں تحریر میں پختہ کاری ہو گی وہاں الفاظ کو گرفت میں لانے کے فن سے بھی آشنا ہو جائے گا۔ آگے چل کر وہ اپنے روحانی اُستاد ادبی آسمان کا ایک جیتا جاگتا چمکتا دمکتا ہمیشہ روشن رہنے والا ستارہ منشا یاد کو لکھا خط استاد شاگرد رشتے کی اہمیت و محبت و خراج عقیدت کی بہترین مثال ہے۔ اس کے بعد افسانچوں کا باب ہے جن میں ہمارے معاشرے اور سماج کی ان گنت خرابیوں کی نشاندہی کی گئی ہے مزے کی بات یہ کہ مختصر پیرائے میں ایک مکمل تحریر پڑھنے کو ملتی ہے۔ یہ نعیم یاد کی ہنر مندی کی بہترین کاوش قرار دی جا سکتی ہے۔ یہاں پبلشر کی کوتاہی نمایاں نظر آتی ہے صفحات نمبر ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۳۹ بے ترتیب جُڑے ہوئے ہیں۔ نعیم یاد نے وفا کی خوشبو، سیراب خواہش، دُہرے قدم، جذبہ ایمانی، وفاداری، بھوک کا بل، ذات کا معیار، مجبوری، دیگر ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی تعفن زدہ ڈھیریوں کی نشاندہی کی ہے جہاں سے ہم روزانہ پہلے پہل ناک پر رومال رکھ کر گزرتے تھے اب عادی ہو جانے سے کئی بار وہاں سے گزرتے ہیں لیکن اس گندی یا بدبو کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ہم اس بدبو کے عادی ہو چکے ہیں۔ مجھے ایک مزاحیہ اداکار کی وہ بات یاد آ گئی کہ "مجھے پیرس بالکل اچھا نہیں لگا" دوسرے نے پوچھا "وہ کیوں" وہ اس لیے کہ وہاں کوئی گندہ نالہ ہی نہ تھا مجھے کہیں بھی بدبو سونگھنے کو نہیں ملی" بات میں مزاح تھا لیکن تھی حقیقت۔ نعیم یاد نے حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے جن حقیقتوں پر ہم مٹی ڈال چکے ہیں۔ محمد نعیم یاد منشا یاد کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ مجھے اُمید ہے محمد نعیم یاد یقیناً منشا یاد کے پاؤں کے نشانات پہ چلتے ہوئے اپنے ادبی سفر کو جاری رکھتے ہوئے یقیناً منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

میں نے جن باتوں کی نشاندہی کی ہے میرا مطالبہ ہرگز تنقید نہیں تنقید برائے اصلاح ہے اگر نعیم یاد سمجھیں۔ یہ اوائل عمری یا ابتدائی تحریر ہے یقیناً کمیاں سہوا نہیں ہو جانا فطری امر ہے۔ آنے والے وقت میں نعیم یاد کو ایک منفرد مقام پہ کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ لکھتے رہو نعیم۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

ڈاکٹر شفیق آصف / سرگودھا

اس کا ہے انتظار پھر شاید
دل ہوا بے قرار پھر شاید
سسکیاں سن رہا ہوں میں شب کی
چاند ہے سوگوار پھر شاید
نقش پا ڈھونڈتا ہے گلیوں میں
راستے کا غبار پھر شاید
آنسوؤں کی طلب ہے آنکھوں کو
وقت ہے شعلہ بار پھر شاید
اپنے خوابوں کے در کھلے رکھنا
آنے والا ہے یار پھر شاید
زخم پھر لب کشا ہوئے آصف
آ رہی ہے بہار پھر شاید

....

وہ ملا تو جانے کیوں اک شور سا برپا ہوا
بات معمولی تھی سارے شہر میں چرچا ہوا
چل رہی تھیں سارے جنگل میں ہوا کی برچھیاں
پاس ہی اک جھونپڑی میں دیپ تھا جلتا ہوا
کل ستارے رو رہے تھے بے کسی پر جب مری
چاند کو دیکھا تھا میں نے جھیل میں ہنستا ہوا
جانے کب اور کس جگہ سانسوں کو آزادی ملے
دور تک اک سلسلہ ہے جس کا پھیلا ہوا
اک کھلونے کی طرح انسانیت کا ہے وجود
شاہراہِ زندگی پر ٹوٹ کر بکھرا ہوا
لوگ کہتے ہیں جسے تصویرِ زخمِ آرزو
گلشنِ احساس میں وہ پھول ہے مہکا ہوا
میری آنکھیں رات دن بس اس کی جانب ہیں شفیق
ان خلاؤں سے پرے وہ کون ہے ٹھہرا ہوا

ماہنامہ ارژنگ اور اس کے گوشہ جات کی ادبی اہمیّت وافادیت

مہر محمد خالد ھرل

زیر مطالعہ ادبی رسالہ ''ماہنامہ ارژنگ لاہور'' سے شناسائی مجھے ڈاکٹر محمد ریاض شاہد کے ذریعے ہوئی۔ انھیں ادبی رسالوں سے عشق ہے اور اپنے اس عشق کا وہ پرچار بھی خوب کرتے ہیں۔ رسالہ ''ارژنگ'' کے وہ بہت بڑے پرچارک ہیں۔ ادبی رسالہ ''ارژنگ'' نومبر ۲۰۱۶ء ناز اوکاڑوی کی شفقت سے حسن عباسی نے مجھے ارسال کیا۔ اُن کی ذرہ نوازی میرے لیے طرۂ افتخار ہے۔ مادیت کے اس دور میں ایسے رسائل و جرائد کا قحط ہے۔ الیکٹرانک میڈیا نے رسائل و جرائد کی وقعت کو متاثر کیا ہے۔ اور دوسری جانب کتب بینی کا ذوق ماند پڑا ہے۔ ان حالات و واقعات کے باوجود اہل زبان و ادب اپنی تگ و دو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ذوق و شوق جب کمال تک پہنچ جائے تو ایسے معرکے سرزد ہوتے ہیں جو حالات و واقعات کا رُخ بدل دیتے ہیں۔

دنیائے ادب میں اب بھی گنے چنے رسائل و جرائد ہیں جو زبان و ادب کے لیے بے دریغ اور بے مثال کام کر رہے ہیں۔ رسالہ ''ارژنگ'' کا بھی ایسے ہی معتبر رسائل میں شمار ہوتا ہے۔ جو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ رسائل و جرائد ادب کے میدان میں آبِ حیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح ''ارژنگ'' زبان و ادب کی حیات و بقا یا احیاء و بقا کے لیے ایک سرگرم اور فعال ادبی رسالہ ہے۔ جس سے زبان و ادب کے لیے نئے نئے ذر وا ہو رہے ہیں۔ ادب تحریر و تقریر کا محتاج ہوتا ہے۔ جب تک تحریر و تقریر کا کام جاری رہتا ہے ادب قید جمود سے آزاد رہتا ہے۔

مدیر اعلیٰ، عامر بن علی اور حسن عباسی کے کمالِ دست ہنر کا ''ارژنگ'' ایک اہم نمونہ ہے اُن کی باہمی یگانگت و تجوگ علم و ادب کی آئینہ دار اور عمدہ مثال ہے اور اُن کے ادبی ذوق و شوق پر دال ہے۔

ادب کسی کی وراثت حراست نہیں ہوتا ہے بلکہ علم و ادب فہم و فراست کا متقاضی ہے علم و ادب کا معاملہ مال و دولت کے عین برعکس ہے۔ غالب جو زبان و ادب کا بے تاج بادشاہ اور اقلیم سخن کا شہنشاہ تھا، مال و دولت کے حوالے سے مقروض اور محتاج تھا، ہنرِ گفتگو، سخن شناسی، اور سخن وری دنیائے دانش و بینش کی دولت بدل ہے۔

میرے خیالِ ناقص کے مطابق جنھوں نے علم و ادب کی آبیاری اور فروغ گیری کا ذمہ اٹھایا وہ دنیائے فانی میں اَمر ہوئے، اور تا فنائے رونقِ آب و گل اُن کو شہرت تام اور عزتِ دوام ملی۔ اور وہ ہر عہد میں اپنے نام و کام اور کلام سے پہچانے اور جانے جائیں گے۔ درحقیقت یہی لوگ دلوں کی سلطنت اور اقلیم اذہان کے حاکم ہوتے ہیں۔ رسالہ ''ارژنگ کا علمی، ادبی اور فکری منظر نامہ بہت وسیع و عریض ہے۔ گوناگوں گوشہ ہائے ادب کے رنگا رنگ گل ہائے رشحاتِ قلم ہیں۔

''ارژنگ'' اپنی فضائے بسیط پر محیط ہے۔ ادب زندگی کی علامت ہے۔ لکھنے لکھانے کا نشہ وہ نشہ ہے جو عمر بھر نہیں اُترتا۔ یہ فزوں سے فزوں تر ہوتا جاتا ہے۔ بقول شاعر:

یہ وہ نشہ نہیں جسے تُرشی اُتار دے

''ارژنگ'' کی ٹیم کا ''ٹیم ورک'' ادبی، علمی اور فکری حوالے سے قابلِ ستائش ہے۔ ''ارژنگ'' کے گوشہ جات نہایت دیدہ دری، نادر کاری اور جگر کاری کی عمدہ مثال ہیں۔ گوشہ حمد، نعت، سلام، نہایت منظم اور مربوط ہے۔ کم و بیش پندرہ شعراء کے کلام کو ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ دوسرے رسائل سے نسبتاً زیادہ کلام ہے۔ ذکرِ خدا ساتھ ذکرِ مصطفےٰ کو بھی نہایت پُرخلوص عقیدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

میرے ذہن و خیال کے مطابق اگر اس گوشہ کا نام ''گوشہ'' ثنائے خدا اور ذکرِ مصطفےؐ '' رکھا جائے تو بہت خوب ہوگا۔

بہر حال یہ گوشہ راحت قلب و جان اور جلائے اذہان و ابصار ہے۔ سلامِ عقیدت کے حوالے سے بہت راحت فزا اور فرحت افزا کلام پیش کیا گیا ہے۔ جس سے قلب و نظر کو تسکین اور سرور ملتا ہے۔ سنیے اور سر دُھنیے:

تشنہ رہا تھا گو وہاں کنبہ حسینؓ کا
سیراب دیں کو کر گیا سجدہ حسینؓ کا

شعراء نے سلام عقیدت میں گلہائے عقیدت شہزادہ گلگلوں کی بارگاہ میں پیش کرکے اپنی عقیدت کا اظہار بہ طریقۂ کمال پیش کیا ہے۔ جس سے

قاری کے لیے تسکین و راحت کا بے انداز سامان ہے۔

''ارژنگ'' مضامین کے حوالے سے بھی بہت جاندار ہے۔ ڈاکٹر وحید احمد کا مضمون ''شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں'' ایک جامع اور پُر مغز مضمون ہے۔ جس میں موصوف نے اپنے زورِ علمی و فکری سے تحریر کو چار چاند لگائے ہیں۔ موصوف اختر رضا سلیمی کے ناول کا بہت اچھا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے جملہ پہلوؤں کو احاطۂ تحریر میں لا کر اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

طبیعات اور مابعد الطبیعات کی مختلف حوالوں سے وضاحت کی ہے۔ ادب کے طالب علم کے لیے یہ ایک بہت اچھا مضمون ہے جس سے اُدبا کے نقطۂ نظر کے پیچیدہ پہلو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ موصوف نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے شعری و نثری حوالے سے اپنی تحریر میں جان پیدا کی ہے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مُسلّم ہے کہ مضمون کو سمجھنے کے لیے خاصا ذہن و دماغ لڑانا پڑتا ہے۔

مضمون: ن م راشد از ساحل سلہری ادبی، تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کا ہے۔ جس میں مضمون نگار نے راشد کی ادبی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لیے (ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔

ادب میں راشد اپنی منفرد ڈگر کا شاعر ہے، شاعری کے حوالے سے ان کی اپنی اپنی الگ جان پہچان ہے۔ بانیانِ اردو نظم کے حوالے سے اُن کا نام متنازعہ ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ اُردو نظم، کے تمام میدانوں میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اردو نظم کو ایک ایسی ڈگر پہ لائے، جس سے پہلے اُردو نظم کی وہ ساکھ نہ تھی، جو اسے راشد کے اندازِ بیان اور رنگ و آہنگ سے ملی۔

ن۔م۔ راشد اردو زبان کا ایک قد آور شاعر ہے۔ جس نے زبان و ادب میں بے دریغ اضافہ کیا۔ انہوں نے اردو ادب کے دامن کو متنوع موضوعات و تخیلات سے متعارف کروایا۔

انہوں نے قدماء کے رجحان سے انحراف کرتے ہوئے نئی جہتوں سے شاعری تخلیق کی راشد کے حوالے سے سلہری صاحب کا مضمون ایک خوب سعی کی ہے۔

مضمون: ''محبتوں کا شہر یار از'' اکرم باجوہ بورے والا'' ایک شاعر کے حوالے سے ایک عمدہ شذرہ ہے۔ یہ تعارفی ریت بہت مستحسن اور اہمیت کی حامل ہے۔ میں بذاتِ خود اس کا قائل ہوں، کہ شعراء اُدباء اور فُضلاء کا یہ حق بنتا ہے کہ ان کے نام، کلام اور کام کو پذیرائی دی جائے، جو لوگ بھی، شبانہ روز محنت سے، جگر کاوی سے اور جانکاری سے اختراعی اور تخلیقی مساعی کرتے ہیں اُن کے کام کو سراہنا ہر اہلِ علم کی ذمہ داری ہے۔ باجوہ صاحب نے اس حوالے سے محمود غزنی کی غزل کو پرکھا جانا اور اس کے اوصاف کو احاطۂ تحریر میں لاتے ہوئے شاعر کو ادبی دنیا کے کینوس کی زینت بنایا ہے۔

شاعری معاشرے کی خدوخال، احوال اور آثار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ شاعر کا معاشرے سے ایک گہرا انسلاک ہوتا ہے۔ اس کے ذہن و دماغ میں معاشرتی اقدار، حسن و قبح اور رزم گاہ کے نقوش ہوتے ہیں جن کی تصویر وہ شعروں میں کھینچتا ہے۔ باجوہ صاحب نے اسی حوالے سے محمود غزنوی کی غزل کے نکھار کو نکھارا ہے۔

مضمون! عارف منصور (ملتانی) از زاہد محمود شمس ملتان، عارف منصور (ملتانی) کی وفات پُر ملال پر ایک پُر ملال تبصرہ ہے۔ جس میں موصوف نے عارف منصور سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے نام اور کام سے قارئین کے روشناس کرایا ہے۔ نعت اور غزل کے حوالے سے ان کے کام کو سراہا گیا ہے۔

نعت ایک ایسا پُر تاثیر اور مقبول عمل ہے جس سے نجات اُخروی کے در کھلتے ہیں۔ نعت گوئی اور نعت خوانی میں اُن کا انداز، اسلوب اور طرز بیاں لائق تحسین ہے۔ ایک شعر سنیے اور سر دھنیے!

شکر تیرا ادا کس طرح میں کروں
اپنے محبوبؐ کا امتی کر دیا

نعت کا فروغ پر مسلمان کی ذمہ داری ہے یہ اصل کام ہے جس سے ہمارے دلوں کو سکون و سرور ملے گا۔ تعارف کے حوالے سے موصوف نے معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس مستحسن اور عمدہ کام کے لیے ہر ادبی رسالے میں ایک باقاعدہ اور الگ سے گوشہ ہونا چاہئے، جس میں سرورِ کائناتﷺ کے لیے گل ہائے عقیدت کھلانے والوں کی نگارشات کا اہتمام کیا جائے۔ یہ لکھنے والے کا ادبی تعارف کرایا جائے۔ اور اس کے کام کا پرچار کیا جائے، ادبی رسائل و جرائد بطور ایک پرچارک کے کام کریں۔

طنز و مزاح کے حوالے ''خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والی'' میں از عطاء الحق قاسمی ایک پُر مزاح تحریر ہے۔ جس میں موصوف نے

میدان ظرافت میں اپنے قلمی وعلمی جواہر دکھائے ہیں۔ اپنے دھیمے لہجے میں انہوں نے قارئین کو مسرور کیا ہے۔

طنز ومزاح ادب کی جان اور آن ہوتا ہے اس کو ''میٹھی چھُری'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سے اصلاح معاشرہ اور فلاح افراد درکار ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ہجو کے برعکس ہوتا ہے۔ مزاح پوشیدہ پہلوؤں کا انکشاف ہوتا ہے۔ جس سے مذکور کے جملۂ حسن وقبح کو ظرافت کی سان چڑھایا جاتا ہے۔

رسالہ ''ارژنگ'' میں یہ گوشہ اپنی انفرادیت کا حامل ہے۔ جو قائین کے ذوق وشوق کو دوبالا کرتا ہے۔ موصوف نے کردار کی کرداریت کو جلا دی ہے۔

''ارژنگ'' کا گوشہ شاعری (غزل، نظم) بہت وسیع اور وقیع ہے۔ جس میں نئے شعراء کے کلام کو شامل کرکے شعراء کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ شعراء آصف ثاقب، خورشید بیگ، احمد سجانی آکاش، محمد ممتاز راشد، نعمان احمد ہاشمی اسد عباس خان، حسین الفت بلوچ، محمد الیاس طائر، رفعت علی علوی، زعیم رشید وغیرہ کے کلام کو پیش کرکے اپنی ذمہ داری کو ادبی لحاظ سے نبھایا ہے۔

نظم کے میدان میں جن شعراء کے کلام کو پیش کیا گیا ہے، سید اسماء جعفری، نجمہ یاسمین، یوسف ثروت زہراء اور انیس احمد وغیرہ کے کلام، نام اور کلام کو زینتِ صفحات بخشی گئی ہے۔ ''ارژنگ'' اس لحاظ سے ادبی، علمی اور تخلیقی کاموں کے پرچار کا نمائندہ اور جہت نما رسالہ ہے۔

سفرنامہ: ''چار دن وادیٔ کشمیر میں'' از ایم آر شاہد۔ سفرنامہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک سفری روداد ہوتا ہے جس میں موصوف اپنے سفر کی کہانی دلفریب انداز میں بیان کرتا ہے تاکہ قاری کی طبیعت بوجھل نہ ہو۔

سفرنامے سے کسی ملک، شہر اور گاؤں کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے اس علاقے کے جغرافیائی خدوخال، معاشرتی اقدار اور تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کے اطوار زیست کی رنگین کہانی بیان کی جاتی ہے۔

شاہد صاحب نے اپنے سفرنامے میں وادیٔ کشمیر جو واقعی ہی بے نظیر ہے۔ اس کے مناظر، نظارے اور تروتازگی کے دلکش متعلقات بیان کیے ہیں۔ ''ارژنگ'' کا یہ گوشہ بھی بہت منفرد انداز کا حامل اور کامل ہے۔

سفرنامہ: ''سفرنامہ چین'' از سعدیہ بتول، ایک ملک کی مکمل داستان ہے جس میں سعدیہ بتول، نے خوب صورت انداز میں چین کے خدوخال، احوال و آثار اور اطوار کو بیان کیا ہے۔ سفرنامہ پڑھتے ہوئے قاری کو متاثر بھی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ ملکِ چین کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔

سفرنامہ، درحقیقت کسی ملک کے جغرافیائی خدوخال اور معاشرتی اطوار کی ایک مکمل تاریخ ہوتا ہے۔ جس کو نثری انداز میں بیان کرکے دلچسپ بنایا جاتا ہے۔

اس حوالے سے موصوفہ کا سفرنامہ بے حد دلچسپ ہے۔

افسانہ: ''بنسی باز'' از موپساں / مترجم سمندر منصوری، ایک بہت اہمیت کا حامل افسانہ ہے۔ افسانے کی فضا بھی مختلف رنگوں سے مزین ہوتی ہے۔

اس سے زندگی کے نہاں تہ خانے بام سخن کی زینت بنتے ہیں۔ زندگی کی بُنت میں کئی نسلوں کا خون، رسم ورواج اور حقائق چھپے ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار انہیں تہوں کو ہولے ہولے کھولتا چلا جاتا ہے۔ افسانہ دراصل کسی معاشرے کی داستان ہوتا ہے جس کا تانا بانا معاشرے کے افراد، رسم ورواج اور رسوم حیات سے بُنا جاتا ہے۔ زیرِ نظر افسانہ میں پیرس کی وجہ سے جو حالات در آئے، اُن کا ادراک کرتے ہوئے افسانہ نگار نے اپنے قلمی اور فکری جوہر کو قلم کے ذریعے صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔

فسانہ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے نہایت شد ومد اور محنت سے کام کیا ہے جو اس کی زیرکی اور بالغ نظری کا ثبوت ہے۔ افسانہ کی بُنت، کرداریت اور وحدت افسانے کے نکھار میں اضافہ کرتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ افسانہ اپنے موضوع کے لحاظ سے تمام افسانوی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

افسانہ: ''آنکھوں کے راز اور خول'' از تین علی ایک بامعنی افسانہ ہے جیسا کہ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ افسانہ زندگی کے حقائق کی ایک ایسی خوبصورت کہانی ہوتا ہے، جس میں زندگی کے ہو بہو نقوش کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس کو پڑھ کر ذہن کر زندگی کے کئی سربستہ راز منظر عام پر آئے ہیں۔ افسانہ نگار نے بھی بڑی مہارت سے ایک ایسے ہی راز کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

ادیب لوگ عجیب طبائع کے مالک ہوتے

ہیں۔ ہر منظر، ہر واقعہ اور ہر حادثہ کو ایک الگ زاویے سے دیکھتے ہیں اور پھر اس کو لباس لفظ و معنی میں بیان کر کے اس کو آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں۔ یہی صورت حال ہم میں افسانے میں بھی دیکھتے ہیں۔

افسانہ: ''وہ کون تھی'' از او ہیزی رترجمہ: احمد عدنان طارق نے بہت اچھوتے انداز میں افسانے کا ترجمہ کیا ہے، یہ گوشہ ''ارژنگ'' کی اہمیت اور فوقیت کا ضامن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''ارژنگ'' نے انکساری کی اہمیت اور محنت کو فوقیت دی ہے۔ جس سے ادب فزوں تر ہوتا رہے گا اور زبان ترقی پائے گی۔

''ارژنگ'' کے گوشے میں شاعری میں بہت سے شعراء کے کلام سے متعارف کروا دیا گیا ہے پروفیسر ارجمند قریشی کا نعتیہ کلام بہت پُر مغز اور پُر معنی ہے۔ نعت بذاتِ خود کیف و سرور کی سلطنت ہے۔ جس میں قاری داخل ہوتے ہی سرمستی سے جھوم اُٹھتا ہے۔ موصوف نے اپنے قارئین کو سرورِ کونین ﷺ سے اپنی والہانہ عقیدت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے لفظ و معنی سے سلطنتِ نعت کو سجایا ہے۔ اور اس روایت کو جاندار اور رواں رکھنے کی سعی مشکور کی ہے۔

محمود غزنی: کا کلام آہنگ و ڈھنگ کے حوالے سے نہایت عمدہ کاری اور فن کاری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ جس سے شعری روایت کو تقویت ملتی ہے اور شعری ادب میں وسعت در آتی ہے۔

خلیل فاروقی: کی غزل ایک منفرد لہجے اور زبان کی حامل ہے۔ جس میں ایک توازن اور جانداری ہے۔ غزل کے زمرے میں ان کا کلام ایک معتبر سعی اور جاندار اضافہ ہے۔

سعید اقبال سعدی: کا کلام شعر مختصر بحر کی ایک موجزن لہر ہے جس سے ایک سحری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

قارئین پہ سحر طاری ہوتا ہے جس میں وہ لوٹ پوٹ جاتا ہے۔ اچھا شعر سحری کیفیات اور رومانی جذبات کو مہمیز لگاتا ہے جس سے سرخوشی اور سرمستی پیدا ہوتی ہے۔

شعری گوشے میں طارق چغتائی کی غزلیات ایک الگ آئینہ خانہ سجاتی ہوئی نظر آتی ہیں غزل متنوع موضوعات کی متحمل ہوتی ہیں۔ اس سے مختلف گوشہ ہائے حیات کے در وا ہوتے ہیں۔ شعری موضوعات مختلف کیفیات کے حامل ہوتے ہیں۔ جس سے معاشرتی احوال و واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ طارق چغتائی کی غزلیات ایک منفرد اہمیت کی حامل ہیں۔

اقرار مصطفیٰ: کی غزلیات چھوٹی بحر میں بہت عمدہ شعری نمونہ ہیں۔ انہوں نے اختصاریت میں جامعیت کو چھپا رکھا ہے۔ ویسے شاعری اختصاریت اور کنائت کا نام ہے۔ جس میں ایک طرح کا لطف اور سرور ہوتا ہے۔ اقرار مصطفیٰ کا کلام انفرادیت کا حامل ہے۔

عقیل عباس: نے جو بات کہی پختہ کہی، سو اُن کی شاعری معیاری ہے اور غزل میں تغزل کی چاشنی در آتی ہے۔ جو ان کی چابک دستی اور فنی مہارت کا نمونہ ہے۔

خالق آرزو: نے گوشہ' غزل' ''ارژنگ'' میں انوکھا توشہ رکھا ہے جس سے شعری ادب کی وسعت پذیری کے امکانات روشن ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

خالق آرزو، کے لہجہ ولب میں ایک منفرد رجحان ہے۔

''ارژنگ کا گوشہ: انٹرویو کیپٹن (ر) عطا محمد خاں کے حوالے سے بہت معلوماتی ہے۔ انٹرویوز دراصل زندگی کا ایک کھلا باب ہوتے ہیں۔ جس سے زندگی کا عکس جھلکتا ہے۔ انٹرویوز افراد و معاشر کے خدو خال، اطوار و عادات اور اخلاقیات سے متعلق ایک تفصیلی معلومات کا کتابچہ ہوتے ہیں۔

''ارژنگ'' کا گوشہ ادبی خبریں رتقریبات ادبی معلومات کی دنیا ہے۔ جس سے قارئین کو نو وارد شعراء ادبا اور قلم کاروں کے حوالے سے اُن کے کام، نام اور کلام کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ ادبی کاموں کا پرچار پر وقار انداز میں کیا جا رہا ہے۔ ''ارژنگ'' اس لحاظ سے بہت بڑی ادبی خدمات سر انجام دے رہا ہے۔ اسی طرح تبصرہ کتب رفلیپ ر آراء اور نامہ ہائے احباب کا گوشہ ''ارژنگ'' کے وجود سعید اور ادبی بقاء کا ضامن ہے۔ ''ارژنگ'' کا یہ کام ادبی اُفق کی وسعت کا ذمہ دار ہے جس ''ارژنگ'' کی رجحان سازی اور ادب نوازی کا پرچار اور ثبوت ملتا ہے۔ اس مادیت کے دور میں جہاں فرصت کم اور مسائل زیادہ ہے۔ ''ارژنگ'' نے اس جہد بلیغ اور کارِ پُر تاثیر کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اللہ تعالیٰ ''ارژنگ'' کے وابستگان کو یہ سلسلہ جاری رکھنے کی ہمت سے نواز دے تاکہ اُردو ادب کی فروغ گیری کا سلسلہ جاری رہے۔ (آمین)

لاہور

فرح ناز/کینیڈا

لاہور ایک بڑا ہی نرالا شہر ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ داتا دی نگری۔ نئیں ریساشہر لاہور دیاں۔ جنے لاہور نئیں تکیا او جمیا ای نئیں۔ لاہور لاہور اے۔ آپے برج لاہور دے۔ زندہ دلان لاہور کا شہر لاہور۔ وغیرہ وغیرہ۔

لاہور ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے اس کا اپنا ہی رنگ ڈھنگ، رہائش اور ثقافت ہے۔ لاہور صوبہ پنجاب کا دارالخلافہ اور ایک اہم ترین مقام ہے۔ لاہور کو باغات کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اندرون لاہور شہر بارہ دروازوں کا شہر ہے۔ اور اپنے روایتی کھانوں کے لحاظ سے بھی مشہور ہے۔ لاہور بے شمار خصوصیات کا حامل ہے۔ اس نے زمانے کی تلخی، نرمی اور گرمی کو سہا ہے۔ سب سے بڑھ کر اس شہر پر بزرگان دین کی نظر التفات ہے۔ حضرت عثمان علی ہجویری جن کو عرف عام میں داتا گنج بخش کہا جاتا ہے۔ انتہائی برگزیدہ ہستی اور کرامات والے بزرگ تھے یہ بڑے جلالی بزرگ تھے آج بھی عقیدت مند جوق در جوق ان کے مزار پر آتے ہیں۔ ان کی رحلت کو ۹۶۶ سال گذر چکے ہیں۔ لیکن زائرین کی تعداد میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی نے ان کے مزار کی چلہ کشی کی ہوئی ہے۔ حضرت عثمان علی ہجویری کے علاوہ لاہور میں اور بھی بہت سے بزرگوں کا تعلق رہا ہے۔ اور یہ بزرگان دین اسلام کی تبلیغ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں پیر مکی صاحب، مادھو لال حسین، بابا موج دریا، حضرت میاں میر، حضرت میران حسین زنجانی، بیبیاں پاک دامن، سید صوف اور بے شمار بزرگ شامل ہیں جو لاہور ہی میں دفن ہیں۔ دو بادشاہ جہانگیر اور قطب الدین ایبک کا مقبرہ بھی اسی شہر میں ہے۔

لاہور تاریخی عمارات کا بھی شہر ہے۔ دریائے راوی کے پرانے پل سے پار شاہدرہ ٹاؤن کے بالکل شروع میں جہاں "ڈوگے" کے درخت ہیں وہیں سے سڑک جہانگیر کے مقبرے کو جاتی ہے۔ اس سڑک کی حالت کوئی اتنی اچھی نہیں ہے۔ مین سڑک سے تھوڑا آگے جانے کے بعد مقبرہ آ جاتا ہے۔ مقبرہ جہانگیری ۱۶۳۷ میں جہانگیر کی وفات کے دس سال بعد دس لاکھ کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ اس مقبرے میں جہانگیر بادشاہ کی ملکہ نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کا مقبرہ بھی ہے۔ اس کا اصل نام مرزا ابوالحسن اور خطاب آصف خان تھا۔ یہ شہزادی ارجمند بانو یعنی ممتاز محل کا باپ بھی تھا۔

مقبرہ جہانگیر کے داخلی دروازے کی چھت پر ستارے بنے ہوئے ہیں جو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ چمک اٹھتے ہیں۔ مقبرہ جہانگیر اور آصف خان کے مقبروں کے درمیان ایک سرائے تعمیر کئے گئے ہیں جن کو سرائے اکبری کا نام دیا گیا ہے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے دور حکومت میں اس عمارت کو چھاؤنی میں تبدیل کر دیا اور کافی نقصان پہنچایا تھا۔ جہانگیر کے مقبرے کے اردگرد چالیس کمرے ہیں جن کو مراتب خانے کا نام دیا گیا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد چالیس قاری چالیس روز تک وہاں قرآن خوانی کرتے رہے تھے۔ جہانگیر کی قبر پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں اور ننانوے نام کندہ ہیں۔ اصل قبر تہہ خانے میں ہے۔ مقبرے کے چاروں اطراف میں باغات، فوارے اور خوبصورت راہداریاں ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں۔ قبر کے عین بالکل باہر جو دروازہ ہے وہ ساگوان کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اور تقریباً چار من وزنی ہے۔ اس دروازے میں کوئی پیچ نہیں لگا ہوا اور اتنا وزنی ہونے کے باوجود صرف انگلی سے کھل جاتا ہے۔ اردگرد جو کمرے ہیں ان میں جگہ جگہ خوبصورت نقش ونگاری کی گئی۔ چاروں اطراف میں اونچے مینار ہیں۔ جگہ جگہ نقش ونگاری کی گئی ہے۔ طرز تعمیر ایسا کہ سخت گرمی میں بھی کمروں میں ہوا کا گزر ہے اور گرمی کا احساس نہیں ہوتا۔ قریب ہی کچھ پکی قبریں ہیں۔ اور عقیدت مندوں نے ان کے قریب درختوں پر رنگ برنگی جھنڈیاں باندھ رکھی ہیں۔ آصف خان اور جہانگیر کے مقبرے کے درمیان ایک وسیع مسجد بنی ہوئی ہے۔ یہ مقبرہ جو کہ ہمارا تاریخی ورثہ ہے حکام بالا کی لاپرواہی اور غفلت کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتا ہے۔ یہاں کی دیواریں ٹوٹی پھوٹی اور شکست وریخت کا شکار ہیں۔ جن کے کچھ حصے بھی منہدم ہو چکے ہیں۔ باغات کا ہی ایک بڑا حصہ خراب ہو چکا ہے۔

(جاری ہے)

کومل جذبوں کا شاعر......ایاز محمود ایاز

پروفیسر آسیہ رانی

جذبات کی دُنیا گویا "جذب" کی دُنیا ہوتی ہے۔اس دُنیائے آب وگِل میں موجود بھی اور اس سے جدا بھی۔آبگینوں سی نزاکت اور دلکشی لیے جذبوں کا جہان، میر تقی میر سے مستعار ترکیب کے مصداق اِک "کارگاہِ شیشہ گری" ہے جہاں ہلکی سی لرزش بھی ان آبگینوں کو ٹھیس پہنچا سکتی ہے۔جذبوں کی اسی حساسیت کے باعث نظران کے اظہار کے لیے بھی کومل اور شائستہ سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔اُردو زبان کی شائستگی اور نفاست ان کومل جذبوں کو اپنے اندر سمونے اور اظہار کا روپ دینے کے لیے انتہائی موزوں ہے۔

بات کرنے کا حسیں طور طریقہ سیکھا
ہم نے اُردو کے بہانے سے سلیقہ سیکھا

موجودہ زمانے میں جذبوں کی کوملتا کو لفظوں کی زبان عطا کرنے کے لیے اُردو کا سہارا لینے والوں میں ایک نام ایاز محمود ایاز کا بھی ہے۔ان کی شاعری احساس وجذبے کی نرم وگرم دھوپ سے عبارت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر حساس دل اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کے مصداق ہر شخص کو ان کے اشعار میں اپنی کہانی اور اپنا دکھ دکھائی دیتا ہے۔ایاز محمود ایاز کا شعری سفر ان کے شعوری سفر کا ترجمان ہے۔اس سفر کی پہلی منزل محبت کے عطا کردہ وہ دکھ ہیں جو کبھی یاد کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی آنسوؤں کی صورت شاعر کے کتھارسس کا باعث بنتے ہیں۔جدائی اور اس کے ستم اگرچہ جاں سوز ہوتے ہیں اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ آنکھوں سے اشکوں کی بجائے "لہو" بہنے لگتا ہے۔مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں یہ غم ہمارے شاعر کو نڈھال کرتے ہیں، اس کی رُوح کو زخم لگاتے ہیں وہیں اس کی شعوری بالیدگی کے لیے مہمیز کا کام بھی کرتے ہیں اور اس کا فن ان سے نکھار پاتا ہے۔ یہاں "یاد"، "سفر"، اور "انتظار" کے استعارے ناصر کاظمی کی یاد دلاتے ہیں۔کچھ اشعار نذرِ قارئین ہیں:

چھپ چھپ کے تیرے ہجر میں رونا تھا ہمارا
یہ حال کسی روز تو ہونا تھا ہمارا

خیمہ دل سے باندھ رکھی ہیں
تیری یادوں کی رسیاں ہم نے

کتنی دلچسپ کہانی میں چلا آیا ہے
وہ میری آنکھ کے پانی میں چلا آیا ہے

تم جو ہوتے تو زندگی ہم سے
تلخ لہجے میں بات کیوں کرتی

ہم کہاں دشت میں دیوار بنانے نکلے
جس کو آنا ہی نہیں تھا اس کو بلانے نکلے

ہم محبت کشید لوگوں پہ
عشق صدمے بحال رکھتا ہے

کتنے ہی اختلاف تھا اس شخص سے مگر
بچھڑا تو جیسے دل پہ قیامت سی ڈھا گیا

دل میں کچھ ٹوٹ سا گیا ہوگا
اس کی یاد آنسوؤں سے تر آئی

اب بھی لگتا ہے پیار ہے اس سے
اس کو سوچا تو آنکھ بھر آئی

دب جائے کسی یاد کی زنجیر کا ماتم
اے تیز ہوا شور کی پازیب بجا دے

تمہارے ہجر کے ماہ وسال سہتے ہوئے
میں تھک گیا ہوں سفر کے ملال سہتے ہوئے

زندگی بھر کمال کرتا رہا
میں تمہارا ملال کرتا ہے

ان تمام اشعار میں نرم وکومل جذبے اپنی چھب دکھاتے ہیں جوکہ شاعر کی حساسیت کے غماز ہیں۔یہیں سے ہمارے شاعر کے شعوری سفر کا اگلا مرحلہ اپنا آغاز کرتا ہے۔شاعر جب دکھ اور غم کی بھٹی سے نکلتا ہے تو کندن کا روپ دھار لیتا ہے۔ اب وہ زمان ومکان سے بے نیاز "تلاشِ ذات" میں سرگرداں ہوتا ہے۔ایک پیارے کے انتظار کی تڑپ اور لوٹ آنے کی آرزو شاعر کو دروں بینی پر آمادہ کرتی ہے جس کے بنا تکمیلِ ذات ممکن نہیں۔وہ اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں اپنے آپ کو تلاش کرتا ہے۔

دل پہ ہر پل خراش رہتی ہے......مجھ کو میری تلاش رہتی ہے۔

اس دوران شاعر کو اپنے من کے بھیتر دکھوں کا ایک جہان آباد دکھائی دیتا ہے۔وہ ان زخموں کو

ہار ماننے کی بجائے حرزِ جاں بنانے کو ترجیح دیتا ہے اور اس کا اظہار کچھ یوں کرتا ہے۔

مجھ میں رہ کر بڑے ہوئے ہیں یہ
میرے دُکھ بھی تو میرے بچے ہیں
بیتے لمحوں کا ساتھ رکھنے کو
میں نے زخموں کی پرورش کی ہے

اپنی ذات کے اس سفر میں شاعر کو گوناگوں تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک جہانِ دیگر ہے جس سے اس کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس مرحلے پر شاعر کو احساس ہوتا ہے کہ دکھوں نے اسے پاش پاش تو کیا ہے مگر انہی کرچیوں سے ایک نئی ذات نے بھی جنم لیا ہے۔ غموں کے ہاتھوں صیقل ہونے کا احساس اس کی شاعری میں یوں نمود پاتا ہے۔

تم پڑھو معنی و مفہوم لکھے لفظوں کے
میں تو چہروں پہ لکھی دل کی زباں جانتا ہوں

اب شاعر انسانی نفسیات کی گہرائیاں بھی ناپتا دکھائی دیتا ہے۔ اس بے حس دنیا میں انسان کو اپنی بقا کی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے کئی بہروپ بھرنے پڑتے ہیں۔ نفسیات ان بہروپوں کو ''پرسونا'' کا نام دیتی ہے۔ صرف تنہائی ہی اس ''پرسونا'' کو بے نقاب کرتی ہے۔ جہاں انسان اور اس کی تنہائی آپس میں لپٹ کر روتے ہیں۔

خوشی کی رنگت کا رنگ چہرے پہ مل رہا ہوں
کسے خبر ہے میں کتنا اندر سے جل رہا ہوں

شاعر کا وہ سفر جو بیرونِ ذات سے شروع ہوا تھا، شعورِ ذات کا جاں کُن مرحلہ طے کرنے کے بعد پھر باہر کا رُخ کرتا ہے۔ اب اس کی شخصیت کی زنبیل میں تجربوں کے موتی بھی ہیں اور احساسِ ذات کے جواہر بھی۔ اس کا شعور اگلی منزل کی طرف گامزن ہے۔ یہاں ایاز محمود ایاز کی شاعری کا کینوس مزید وسیع ہوتا ہے۔ جہاں ایک طرف ذاتی تجربات اور شعورِ ذات کے رنگ بکھرے دکھائی دیتے ہیں وہیں عصری شعور کے رنگ زیادہ نمایاں ہو رہے ہیں۔ زمانہ یا عصر جو سنگ دل بھی اور رحم ناآشنا بھی۔ جہاں جھوٹ کا بول بالا ہے اور سچائی کا منہ کالا ہے۔ جہاں بقول احمد ندیم قاسمی کسی کا اچھا ہونا اس کی معتوبی کا سبب بن جاتا ہے۔ جہاں اونچی اُڑان کا خوف پرندوں کے پر کاٹ دینے پر مجبور کر دیتا ہے اور تتلیوں کی خوبصورتی ہی ان کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ جہاں جنگل کا قانون رائج ہے مگر جنگلوں میں بھی تو کوئی قانون ہوتا ہے۔ جہاں دوست آستینوں میں خنجر چھپائے بیٹھے ہیں اور بشر، بشر کو کاٹ رہا ہے۔

زہر چھڑکا ہوا تھا پھولوں پر
تتلیاں مر گئی ہیں چھونے سے

صیاد ہے خائف میری پرواز سے اتنا
پنجرے میں مجھے ڈال کے پر کاٹ رہا ہے

ایاز اسی باعث تو درندے نہیں آتے
بستی میں بشر کو ہی بشر کاٹ رہا ہے

میں کہانی میں سچ بولنے جو لگ جاتا ہوں
لوگ ہر سُو سے مجھے ٹوکنے آ جاتے ہیں

سانپوں سے کہو چھوڑ دیں ڈسنا اب تو
یہ کام تو اس دور کے انسان کا ہے

دو چار قدم چل کے بدل لیتے ہیں رستہ
ایاز میں کس شہر کے لوگوں میں گھرا ہوں

زندگی تجھ سے بڑھ کے چاہا جسے
اب بھلا ویسا پیار کس کو کروں
ہر کوئی آستین کا خنجر ہے
دوستوں میں شمار کس کو کروں

شاعر کی جان کو کہیں سکون نہیں کہ پہلے غمِ جاناں نے رُوح کو مضمحل کر رکھا تھا لیکن غمِ دوراں نے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی ٹھان رکھی ہے۔ یہ غم اسے زندہ ہی مار ڈالتا ہے۔ یہاں وہ اپنے آپ سے بھی خوفزدہ دکھائی دیتا ہے۔ زمانے بھر سے ٹکرانا پڑا ہے...... مجھے زندہ ہی مر جانا پڑا ہے۔ محبت نے ہراساں کر دیا ہے...... میں اپنے آپ سے ڈرنے لگا ہوں۔

ایاز محمود ایاز عرصہ دس سال سے پیرس میں مقیم ہیں۔ پیرس ادبی فورم کے جنرل سیکریٹری ہونے کے ناتے وہ اردو شعر و ادب کے فروغ میں رات دن کوشاں ہیں۔ اس فورم کے تحت کئی عالمی مشاعرے منعقد کرائے جا چکے ہیں۔ ایاز محمود ایاز کا پہلا شعری مجموعہ محض سولہ برس کی عمر میں منظرِ عام پر آیا اور اب تک ان کے چھ شعری مجموعے ''خزاں کی آخری شب''، ''ترکِ مراسم''، ''تنہائی سے ڈر لگتا ہے''، ''آرزوئے جاں''، ''تم شرطِ زندگی ہو'' اور ''سنو تم لوٹ آؤ نا'' کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں جو سبد گل فروش کی مانند گلہائے رنگا رنگ سے مزین ہیں۔ ان کا شعری اور شعوری سفر ابھی جاری ہے لیکن ایک طویل سفر طے کرنے کے باوجود ابھی بہت سے مراحلِ عشق باقی ہیں جو یقیناً ان کو اردو شاعری کے آسمان کا دمکتا ستارہ بنا دیں گے۔

بے رُتبہ آنکھیں

کتنا آساں ہے یہ کہنا:
یہ تیری ناکامی صلہ ہے تیرے کرموں کا
اسم اعظم سے پہچانے جانے والے
میری نیکی کی سچائی
میری جبیں اور میرے سجدے
تیرے جہانوں کی گردش میں
ٹھوکریں کھا کر ہانپ رہے ہیں

کون پھلانگ سکا ہے اُس کو
میرے خیالوں کی وحشت نے
جو دیوار اُٹھا رکھی ہے
جس کے اُدھر ہے میرے ارادوں
کی اک عاجز دُنیا
جس کے اندھے غار کے اندر
زخمی تدبیروں کے سائے رینگ رہے ہیں
جس کے آگے ہے اک اور ہی دنیا
شمسی نظاموں کے جلووں سے
روشن دنیا...... تیری دنیا
جس کے تلے بے رُتبہ آنکھیں
میری آنکھیں
نادم، بے بس
تیرے کرم کی آس لگائے
پگھل پڑی ہیں

لمحہ لمحہ اُدھڑتی ہوئی زندگی

سائیاں
سائیاں
یہ بتادے ذرا
نیستی اور ہستی کی تمثیل میں
جسم کی اس ادھوری سی تکمیل میں
کتنے فیصد ہے تو
کتنے فیصد ہوں میں!

کیوں فنا کے بگولوں کے
بکھرے ہوئے اَنت میں
لمحہ لمحہ اُدھڑتی ہوئی زندگی
کھینچتی ہے مجھے

کس لیے صرف میں نے ہی دیکھیں یہاں
بے بسی سے گھسٹتی ہوئی انگلیاں
انگلیاں، ریت میں جذب ہوتے ہوئے آب کی
خشک سالی میں گزرے ہوئے خواب کی

سائیاں، سائیاں
یہ بتادے ذرا
ماورائے جہاں جو مرا رُوپ تھا
وہ کہاں رہ گیا......!

یہ مرا جسم تو خاک ہی خاک ہے
خاک کی تہہ میں بھی خاک ہی خاک ہے
خاک میں سب نہاں
یہ زماں...... یہ مکاں
سائیاں
کیوں فنا کی حدوں سے پرے
میں نکلتا نہیں

پچھتاوا

اُس کے دل کے رُکے لہو کی
خیالی دُنیاؤں سے
تھر تھر کانپتی ایک اُداسی پلکیں جھکائے
اک ہونی کے دکھ میں لپٹے
گزرے زمانوں کے رشتوں میں
گلی سڑی سازش کے اندر
اپنا چہرہ ڈھونڈ رہی تھی
کتنے خیال اُمنڈ کر اس کی
مجبوری کو سونگھ رہے تھے
ایک خلش نے اُس رفعت کو پالینے کی خاطر
آنکھوں کی تقدیس میں اپنے خونیں پنجے
گاڑ دیے تھے
میں نے دیکھا
اور فقط میں نے ہی دیکھا
اس بوسیدہ وقت کے پیچھے
وہ اک مرے ہوئے ڈھانچے کی صورت
پڑا ہوا تھا
اُس کے عیبوں کی دلدل میں
دھنسے ہوئے جیون کی سانسیں
ایسی اذیت کا ماخذ تھیں
جن کے اندر جلنے والے پچھتاوے نے
ماتمی دھن کی بوجھل لے پر
بھیگی پلکوں کی چادر سے
خود کو ڈھانپ لیا تھا!!

ہم بھی صحرا میں آ کے بیٹھ گئے
ریت کا گھر بنا کے بیٹھ گئے
بس نوید بہار سُن کر ہی
آس دل میں لگا کے بیٹھ گئے
وصل کی آگ دل میں بھڑکائی
ہجر پھر ہم سجا کے بیٹھ گئے
جب ہمیں روشنی ہوئی درکار
اپنی آنکھیں جلا کے بیٹھ گئے
ہو گئے ہم بھی صاحبِ ثروت
عشق میں سب لٹا کے بیٹھ گئے
اپنے دل کی سناتے کیا ہم، وہ
اپنے قصے سنا کے بیٹھ گئے
نہر کیا ہم نکالتے شاہد
اپنا تیشہ گنوا کے بیٹھ گئے

ضرورتیں تھیں مری اعتراف کرنا پڑا
لہٰذا سچ سے مجھے انحراف کرنا پڑا
انا پرست ہوں لیکن جھکا کسی کے لئے
یہ فیصلہ مجھے اپنے خلاف کرنا پڑا
اڑا ہوا تھا وہ ضد پہ پہاڑ کی صورت
فصیلِ ذات میں اُس کی شگاف کرنا پڑا
چلا گیا تھا جو رشتوں کو توڑ کر یکدم
وہ آ گیا تھا تو اُس کو معاف کرنا پڑا
روایتوں سے جُڑا ہوں اسی لئے مجھ کو
غلاظتوں بھرے رستوں کو صاف کرنا پڑا
تمام راستے جب بند ہو گئے شاہد
حقیقتوں کا اسے انکشاف کرنا پڑا

نہیں میں، تُو ہی تُو ہے، اور کیا ہے
محبت گفتگو ہے، اور کیا ہے
نہ پوچھو خوشبوئے اُلفت کی بابت
فسانہ کُو بکُو ہے، اور کیا ہے
ستارۂ شبِ ہجراں یہ بولا
یہاں بس میں ہوں تُو ہے، اور کیا ہے
تصور اور حقیقت ایک سا ہو
مری یہ جستجو ہے، اور کیا ہے
نمازِ عشق ہو اور تیری ہستی
بھی اک آرزو ہے، اور کیا ہے
وصال و ہجر کے سب مسئلے ہیں
زمانہ بھی عدو ہے، اور کیا ہے
ترا ہونا ہے رونق زندگی میں
وگرنہ ہاؤ ہو ہے، اور کیا ہے
غمِ ہجراں میں تیرا ذکر نہ ہو
مری تُو آبرو ہے، اور کیا ہے

تپش میں جھلسے ہوئے زیست کے ستائے ہوئے
یہ لوگ سائے کی اُمید ہیں لگائے ہوئے
یہ دہشتوں کے مناظر یہ خون کی ہولی
اُجڑ گئے ہیں کئی گھر بسے بسائے ہوئے
امیرِ شہر سے اب خیر کی اُمید بھی کیا
کہ مصلحت کے ہیں بندے بھی بٹھائے ہوئے
وہ جن کے چہرے بہاروں کے ترجماں ٹھہرے
ملے ہیں پیڑ یہ ان کو گلے لگائے ہوئے
ہمارا سلسلہ ملتا ہے سرفروشوں سے
ردائے امن کی خاطر ہیں سر کٹائے ہوئے
ہماری فکر نہیں ملتی جن کی سوچوں سے
ستم تو یہ ہے تری بزم میں ہیں آئے ہوئے
یہ سورماؤں کی بستی کو کیا ہوا شاہد
کھڑے ہیں لوگ سبھی گردنیں جھکائے ہوئے

زمانے بھر سے محبت کا سلسلہ رکھنا
کوئی بھی رشتہ نبھانے کا حوصلہ رکھنا
ترا بھی طرزِ رفاقت ہے عام لوگوں سا
گُلوں سے دوستی کانٹوں سے فاصلہ رکھنا
اُڑان بھرتے رہو آسمان چھوتے رہو
زمین سے بھی مگر اپنا رابطہ رکھنا
یہ مشکلوں میں ترے کام کافی آئیں گے
گلی کے تنکوں سے بھی اپنا واسطہ رکھنا
ہوائے تند سہی غم کی بارشیں بھی سہی
مگر حیات میں ہر چند حوصلہ رکھنا
محبتوں کو زمانے کا خوف لے ڈوبا
عجیب لگتا ہے آپس میں فاصلہ رکھنا
جبینِ شب پہ شکن آئے گی مگر شاہد
فصیلِ شب پہ ہمیشہ دیا جلا رکھنا

راول حسین/لاہور

سب مجھے ایک ایک دھڑکن دیں
میں نے کاغذ پہ دل بنایا ہے

پاؤں جچتے نہیں ہیں کائی پر
تف ہے ایسی کسی رسائی پر
ایک بوسیدہ شہر ہاتھ لگا
اک نئے شہر کی کھدائی پر
ایسے نازک سے واسطہ ہے جسے
چوڑیاں بوجھ ہیں کلائی پر
گھر نہ تقسیم کر مرے بھائی
تیرا احسان ہوگا بھائی پر
ایسے حالات ہیں کہ میرا باپ
معترض ہے مری ہی پڑھائی پر
دو گھڑی کا وصال بھاری ہے
زندگی بھر کی آشنائی پر
کارخانے سے چھٹیاں لوں گا
گاؤں میں فصل کی کٹائی پر

دور سے آج دیکھتے ہوئے لوگ
تھے کبھی مجھ کو چاہتے ہوئے لوگ
رہ میں کیا کیا لگی ہوئی تھی بھیڑ
کھو گئے خود کو ڈھونڈتے ہوئے لوگ
رفتہ رفتہ زباں تک آئیں گے
یہ مری بات کاٹتے ہوئے لوگ
دیکھتا ہوں گلی کے مڑنے تک
بالکونی سے دیکھتے ہوئے لوگ
جانے کب سو گئے اُڑا کر نیند
وہ مرے ساتھ جاگتے ہوئے لوگ

رقص کو سب غزال آئیں گے
جب ترا ہجر گنگنائیں گے
شام شاخوں پہ چہچہائے گی
پیڑ آنگن میں جب لگائیں گے
جس قدر بڑھ رہی ہے بھوک ان کی
لوگ خود کو بھی بیچ کھائیں گے
آپ پاس رہی تو کل کو ضرور
خواب آنکھوں میں لہلہائیں گے
اپنے آنچل پہ ٹانک لو ہم کو
صبح ہوگی تو ڈوب جائیں گے
سر پہ ہیں بھانت بھانت کے گاہک
جانے ہم کس کے ہاتھ آئیں گے
عشق روزی نہیں کہ ساری عمر
ہم کمائیں گے آپ کھائیں گے

سرد لہجہ ہے گرم سایہ ہے
کن رُتوں کا یہ ابر چھایا ہے
سب مجھے ایک ایک دھڑکن دیں
میں نے کاغذ پہ دل بنایا ہے
رنج تصویر کر گئے مجھ کو
تو نے دیوار سے لگایا ہے
رات ہم اشک پی کے سوئے تھے
اور اب دن کو رنج کھایا ہے
میں تو حیران ہوں کہ اشکوں کا
رب نے کیا ذائقہ بنایا ہے
آ کے سر پر مرے سوار ہوا
اس کی آنکھوں پہ کیا بٹھایا ہے

ہم پکارا کیے مسلسل نیند
رہ گئی آنکھ میں مقفل نیند
چھت پہ بھاری ہیں ان کے یہ تیور
لے اُڑے آج شب کی بادل نیند
ایک شب خواب میں تم آئے تھے
پھر میسر ہوئی نہ اک پل نیند
رزق بھی ایک مسئلہ ہے یہاں
کور چشمی کا تو نہیں حل نیند
رات پانی کی طرح بہتی تھی
بھر کے لائے ہم ایک بوتل نیند
کل تو سپنے بھی تھے جب آ نہ سکی
کیا کرے لے کے آج راول نیند

تیرے روبرو

عاشق رحیل/لاہور

مکہ معظمہ کی مقدس اور روح پرور فضاؤں میں سانس لیتے آج میری دوسری صبح ہے۔ یہ صبح اُس شہر کی جو ہر مسلمان کے دل میں آباد ہے یہ جگہ اس شہر کا مشہور علاقہ عزیزیہ کہلاتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں اتنی تعداد میں حاجی ٹھہرائے جاتے ہیں کہ اس کو "حج سٹی" کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہاں کی ہر گلی، ہر سڑک، ہر سٹور اور ہر مال میں حج کی سعادت حاصل کرنے والے مرد و خواتین ہی پھرتے نظر آتے ہیں۔ ہر بڑی بلڈنگ کے آگے مختلف ممالک کے لوگ اپنے ملک کے مخصوص لباسوں میں ملبوس بیٹھے گپ شپ لگاتے نظر آتے ہیں۔ ہمارا پڑاؤ بھی اس علاقے کی ایک چھوٹی سی سڑک پر واقع ایک خوبصورت اور آرام دہ ماحول والی بلڈنگ نمبر 918 میں ہے۔ اس دیار پاک میں ہماری پہلی رات اور فجر کی نماز بیت الحرم میں آئی۔ رات کا بہت سا حصہ عمرہ، سعی اور نفل پڑھتے گزرا۔ فجر کی نماز کے ساتھ نماز جنازہ بھی پڑھی۔ یہ نماز جنازہ پتہ نہیں کتنے انسانوں کی تھی کہ میری قسمت میں ازل سے ہی لکھا گیا تھا کہ میں ہزاروں میل دور سے آ کر اس انتہائی مقدس مقام پر ان کے جنازے میں شرکت کروں۔ اللہ کے اس پاک گھر میں نور کی بارش ہوتی رہتی ہے اور رات اور دن کا فرق ہی نظر نہیں آتا۔ دنیا کے اس مرکزی شہر میں پوری دنیا کے مسلمان اس طرح پھرتے۔ اللہ کے پاک نام کا ورد کرتے اور اُس کے حضور جھک کر عقیدت کے پھول پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے وہ ایک ہی خاندان کے فرد ہوں۔ امیر، غریب، کالے، گورے، عربی، عجمی، افریقی، ایشیائی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ چینی مسلمان کے ساتھ امریکی، انڈونیشیائی کے ساتھ روسی اور مصری کے ساتھ پاکستانی بھائی کندھے کے ساتھ کندھا جوڑے کھڑا اللہ کی حمد و ثنا میں مصروف ہے۔ بھائی چارے اور یکسانیت کی ایسی مثال دنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔ حالانکہ سارے انسانوں کا خون ایک سا ہے۔ پر رسول خدا کا کلمہ پڑھ کے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے والوں کے خون کی تاثیر ہی بدل جاتی ہے۔ اس تاثیر کی کرامت دیکھنی ہو تو اللہ تعالیٰ کے اس گھر کے صحن کی حاضری ضروری ہے۔

میں حج کے سلسلے میں سعودی عرب میں موجود ہوں۔ ویسے "حاجی" میں یہاں آنے سے پہلے ہی ہو چکا ہوں۔ میرا حج لاہور میں ہی ہو گیا تھا۔ وہ اس طرح کہ حج کے سلسلے میں ٹریننگ کے لیے ہمیں ایک دن حاجی کیمپ میں بلایا گیا۔ کیمپ کے مین گیٹ سے اندر داخل ہونے لگے تو وہاں کھڑے سیکورٹی گارڈ نے بڑے ادب سے کہا "حاجی صاحب! ذرا اپنے کاغذات چیک کرائیں" اس طرح سعودی عرب تو رہا ایک طرف ہم حاجی کیمپ میں داخل ہونے سے پہلے ہی حاجی ہو گئے۔ ہینگ لگی نہ پھٹکری پر رنگ چوکھا آ گیا۔ لاہور میں ہی اپنے لیے حاجی کا لفظ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اندر گئے تو کیمپ کا ہر ملازم "حاجی صاحب، حاجی صاحب" کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا۔ یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ نیک کام کا ارادہ یا نیت ہی کرو تو اللہ اجر پہلے ہی دے دیتا ہے۔ یہاں کے ملازموں کا یہاں آنے والوں کے ساتھ سلوک دیکھ کر مجھے یہ لگا کہ یہ کیمپ پاکستان کے شہر لاہور میں نہیں بلکہ کسی مغربی ملک میں ہے۔ ہر ملازم آنے والوں کے آگے بچھ بچھ جا رہا تھا۔ ہر کام بھاگ بھاگ کر خندہ پیشانی سے کر رہا تھا۔ میں اپنی بیوی زاہدہ کے انتظار میں ایک جگہ کھڑا تھا کہ ایک ملازم نے ایک کرسی لا کر میرے آگے رکھ دی اور بڑے ادب سے کہا "حاجی صاحب! تشریف رکھئے کھڑے کیوں ہیں تھک جائیں گے۔" میں واقعی تھکا ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی میرے منہ سے اس کے لیے دُعائیں نکلنے لگیں۔ یہی نہیں اس پر مستزاد یہ کہ ایک ملازم آوازیں دے رہا تھا "ناشتہ کرنے کے لیے حاجی صاحبان ادھر تشریف لے آئیں" فوٹوسٹیٹ اور لیمینیشن وغیرہ بھی مفت کیے جا رہے تھے۔ سب آنے والوں کے بیٹھنے کے لیے رنگ برنگی کرسیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ سب ملازم اپنا فرض ایسے ادا کر رہے تھے جیسے عبادت کر رہے ہوں۔ پڑھنے والوں کو لگ رہا ہو گا کہ میں مبالغے سے کام لے رہا ہوں۔ پاکستان میں ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ میں وہاں سے فارغ ہو کے آیا تو مجھے خود یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہے لیکن یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ میری دعا ہے کہ پاکستان کے سب دفتروں میں ایسا ہی نظام رائج ہو جائے تا کہ ہمارا ملک جنت کا نقشہ پیش کرنے لگے اور ہمیں اس سلسلے میں مغربی ملکوں کی مثال نہ دینا پڑے۔ حاجی کیمپ سے ہی حج سے متعلقہ سارے کاغذات ملے۔ ہماری سعودی عرب کا ویزا لگے ہوئے پاسپورٹ، سعودی عرب ایئرلائن کا ٹکٹ، فلائٹ کا نمبر اور تاریخ، مکہ مکرمہ میں ہماری رہائش کے بندوبست کی تفصیل جو مکتب نمبر ۱۱ اور بلڈنگ نمبر ۹۱۸ تھا۔ اب جس کے کمرہ نمبر ۳۰۲ میں بیٹھا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ میری بیوی زاہدہ دوسری تین عورتوں کے ہمراہ ساتھ والے ہی کمرے نمبر ۳۰۳ میں مقیم ہے۔ کمروں کے نمبر دیکھ کر میں نے اُسے مذاق سے کہا "آپ تو تھری ناٹ تھری کا روپ دھار کر خطرناک ہو گئی ہیں۔ آپ سے تو بچ کر رہنا چاہیے اور میں دفعہ

۳۰۲ کا شکار اللہ خیر کرے۔" اُس نے بڑی عقلمندی کا جواب دیا "ہم تو اللہ کے مہمان ہیں جہاں جی چاہے ٹھہرائے اُس کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ جو ہم محدود عقل والے نہیں سمجھ سکتے۔" میں اُس کے اس عالمانہ جواب سے لاجواب ہو گیا۔ لکھتے لکھتے مجھے یاد آیا کہ لاہور میں جب کسی دوست یار رشتے دار کو پتہ چلتا کہ ہم حج کرنے جا رہے ہیں تو اُن کا سوال ہوتا "کون سا حج؟ سرکاری یا پرائیویٹ؟" مجھے اس سوال کی سمجھ نہیں آتی تھی کیونکہ میں سوچتا کہ کیا حج کی بھی قسمیں ہوتی ہیں؟ حج تو حج ہی ہوتا ہے سرکاری ہو یا پرائیویٹ۔ پر بعد میں پتہ چلا کہ سرکاری اور غیر سرکاری حج میں واقعی فرق ہوتا ہے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق بھی حج تین قسم کا ہوتا ہے۔ حج کی ان قسموں کا پتہ حج کے متعلق ملنے والے پمفلٹوں اور ساتھ رہنے والے لوگوں سے چلا جو مختلف قسم کے حج کر رہے تھے۔ پھر سرکاری اور غیر سرکاری حج میں یہ فرق تھا کہ سرکاری حج میں پیسے کم لگتے تھے۔ اس کا بندوبست وزارت حج کے ذمے ہوتا ہے۔ پرائیویٹ حج کا انتظام ٹریولنگ ایجنسیاں زیادہ پیسے لے کر کرتی ہیں۔ سرکاری حج میں سہولتیں کم اور پرائیویٹ میں زیادہ ہوتی ہیں۔ اس فرق کا اندازہ یہاں آ کر ہوتا ہے۔ ہم گورنمنٹ والے حج پر آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں حرم پاک سے سولہ کلومیٹر دور اس "حج سٹی" عزیزیہ میں ٹھہرایا گیا ہے۔ ہماری اس بلڈنگ نمبر ۹۱۸ سے بیت اللہ جانا ہو تو راستے میں بس بدلنی پڑتی ہے۔ اگرچہ بسوں کا انتظام بہت اچھا اور مفت ہے لیکن بہت زیادہ رش ہونے کی وجہ سے بس بدلنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ خصوصاً میرے جیسے عمر رسیدہ انسانوں کو۔ پہلی بس ایک اڈے پر جا کر سواریاں اُتار دیتی ہے اور وہاں سے دوسری بس میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ جس میں بہت دھکم پیل ہوتی تھی۔ جوان اور بوڑھے کا بہت کم خیال کیا جاتا تھا۔ اس میں پتہ نہیں کیا حکمت عملی ہے کہ پہلی ہی بس منزل مقصود تک کیوں نہیں لے جاتی جب کہ دوسری بس صرف ایک سرنگ پار کرواتی تھی تو بیت الحرم کا منظر سامنے آ جاتا تھا۔ ویسے پرٹرانسپورٹ کا بندوبست بہت عمدہ ہے۔ بسیں دن رات چلتی ہیں۔ ایک کے چلنے کے بعد دوسری تیار ملتی ہے۔ پرائیویٹ حج کرنے والوں سے زیادہ پیسے وصول کیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کو بیت اللہ کے بالکل نزدیک فائیو سٹار ہوٹل میں یا بہت ہی آرام دہ بلڈنگوں میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ حرم پاک کے عبدالعزیز گیٹ کے سامنے "کلاک ٹاور ہوٹل" کے دروازے تو کھلتے ہی حرم کے صحن میں ہیں اور کئی منزلہ ہوٹل کی ہر منزل کی کھڑکیاں حرم کی طرف ہیں اور ان میں سے ہر وقت اللہ کے گھر کی زیارت کی جا سکتی ہے۔ یہ ہوٹل ہے بھی حکومت کا ہی۔ سنا ہے تجربہ نہیں کہ پرائیویٹ حج کرنے والوں کو بسوں میں نہیں رُلنا پڑتا۔ ان کے لیے ٹیکسوں کا بندوبست ہوتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں نے اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا کہ "اے اللہ تعالیٰ آپ نے بھی پیسے والوں کو اپنا ہمسایہ بنایا ہے جو جب چاہیں آپ کے گھر میں حاضری کے لیے آ جاتے ہیں۔ ہمیں دور رکھا ہوا ہے کہ آج ہم جمعے کی نماز ادا کرنے کے لیے بھی آپ کے گھر نہ آ سکے۔ حالانکہ ہم اپنے ٹھکانے سے گیارہ بجے نکلے تھے لیکن ہماری بس کی سواریوں کو پہلے اڈے سے ہی واپس کر دیا گیا کہ اب اللہ کے گھر میں مزید لوگوں کے لیے گنجائش نہیں رہی تھی۔ آگے جانے کی اجازت نہیں۔ اپنے علاقے کی کسی مسجد میں ہی یہ فریضہ ادا کر لو۔ ہم بہت مایوس ہوئے کہ ہمیں بیت اللہ میں حاضری کی اجازت نہ مل سکی لیکن واپس آ کر اپنی بلڈنگ کے نزدیک ہی ہم نے جس مسجد میں جمعے کی نماز ادا کی اس کے امام صاحب کے خطبے نے ہماری ڈھارس بندھائی اور اللہ کی رحمت کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ وہ اس طرح کہ جماعت کھڑی ہونے سے پہلے یہاں کے ایک نمازی نے بڑی شستہ اُردو میں اعلان کیا "ہندوپاک کے نمازی جمعے کی نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لیے مسجد میں ہی ٹھہریں۔ کیونکہ خطیب صاحب کا کہنا ہے کہ جو خطبہ انھوں نے دیا ہے عربی زبان جاننے والوں کے لیے اس کا ترجمہ اُردو میں پیش کیا جائے گا۔ ترجمہ کرنے والے نے بتایا کہ "مکہ معظمہ کی ہر مسجد میں یہی خطبہ دیا گیا ہے۔ اس لیے ہر اُس مسجد کو حرم پاک میں ہی سمجھا جاتا ہے جس میں یہ خطبہ پیش ہو گیا ہو۔" یہ مسئلہ سن کر ہمارے دل خوشی سے اُچھل پڑے۔ کیونکہ اللہ کی پاک ذات نے ہمیں دھوپ میں سڑک پر بیٹھنے کی مشقت سے بچا لیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے جیسا کمزور انسان اس صعوبت کو برداشت ہی نہ کر سکتا اور ساتھ جانے والی عورتوں کو بھی مشکل پیش آئی تھی۔ کیونکہ انہیں تو کہا ہی صنف نازک جاتا ہے۔ بات دور نکل گئی۔ بات میں حجوں کے فرق کی کر رہا تھا۔ سرکاری حج والے اپنی مرضی کا کھانا نہیں کھا سکتے۔ انہیں مجموعی طور پر جیسا بھی اور جو بھی کھانے کو دیا جائے انہیں کھانا پڑتا ہے۔ وہ اگر کھانا نہیں چاہتے تو پیسے خرچ کر کے بازار سے اپنی من مرضی کا لے آئیں۔ پرائیویٹ حج والے فائیو یا ان سے کم ستاروں والے ہوٹلوں میں اپنی پسند کے کھانے کا آرڈر دے سکتے ہیں۔ میرے ایک بزرگ ٹھیک ہی کہا کرتے ہیں "پیسہ گر خدا نہیں مشکل کشا تو ہے" اس پیسے کے بل بوتے پر پیدل طواف اور سعی نہ کرنے والوں نے یہ فریضے وہیل چیئرز کے ذریعے ادا کیے۔ پیسے نہ ہوتے تو جو دوسروں کے چہروں کی طرف ہی دیکھتے رہتے کہ وہ ان کی مدد کریں۔

سفرنامہ تھائی لینڈ

وحید قندیل آسٹریلیا

کبھی کبھار انسان کچھ سوچتا ہے اور اُس کی قسمت اور حالات اُسے کسی اور جانب لے جا رہے ہوتے ہیں۔ ہم اپنی طرف سے مختلف خواہشات کے مطابق پروگرام ترتیب دیتے ہیں مگر قسمت اپنے طریقے سے اُن کا رُخ بدلتی رہتی ہے۔

دو ماہ قبل میرے سالے صاحب "طاہر شفیق" کی شادی کی تاریخ طے پائی جو کہ دسمبر کے آخری دنوں میں کرسمس کے ٹائم پر لاہور میں منعقد ہوئی ہے۔ مجھے بھی دعوت ملی اور حسبِ معمول سسرال کے دعوت نامے کو رد کرنا۔ بیوی سے جنگ کی تیاری کے برابر ہے سو سرِ خم پہ تسلیم میں نے بھی شادی میں شمولیت کی حامی بھر لی۔ میں نے اور مریم (بیوی) نے پروگرام بنایا کہ مریم ایک ماہ قبل لاہور روانہ ہو جائے گی۔ جہاں گھر والوں کے ساتھ شادی کی تیاری کرنی ہے شامل ہو جائے گی۔ اور میں دسمبر کے آغاز میں شادی کے دنوں کے قریب پہنچ جاؤں گا۔ مگر ٹریول ایجنسی والوں نے مرے ٹکٹ کی قیمت بتا کر مجھے حیران ہی کر دیا۔

ایسا کیوں نہ ہوتا؟ کہ دسمبر میں پوری دُنیا سے لوگ کرسمس اور نیو ایئر نائٹ یا چھٹیاں انجوائے کرنے کیلئے اپنے پیاروں سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ اور جشن و نشاط کی محفلیں سجاتے ہیں۔ اور ایسے آنے جانے والے لوگوں کے رش سے جہازوں کیلئے دسمبر مصروف ہو جاتا ہے۔ یعنی Peak time شروع ہو جاتا ہے۔

بہر حال میں نے مریم کا ٹکٹ تو لے لیا مگر مجھے بھی دسمبر کی بجائے نومبر کے آخری دنوں یعنی 30 نومبر سے پہلے پاکستان روانہ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ بعد میں یکم دسمبر سے ٹکٹ انتہائی مہنگے ہو جائیں گے۔

مریم کا ارادہ تھا کہ وہ دبئی کے راستے جائے۔ اُسے امیریٹ ایئر لائن میں جانے اور دبئی شہر کو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ مگر ٹکٹ مہنگے ہو گئے تھے۔ اتفاق سے اتحاد ایئر لائن اور ملائیشیا بھی کافی زیادہ مہنگے لگ رہے تھے۔ سو آخر کار حسبِ معمول حسبِ توفیق ایک تھائی ایئر لائن ہی تھی جس کا ٹکٹ خریدنا پڑا۔ مریم اکیلے دبئی میں رُکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ ہم اکٹھے دبئی ساتھ دیکھیں اور گھومیں۔ مگر مجھے تھائی لینڈ جانا تھا۔ سو اُسے بھی میرے ساتھ تھائی ایئر لائن کا ہی ٹکٹ خریدنا پڑا۔

ہمیں اکثر یہ سہولت میسر آجاتی ہے کہ آسٹریلین پاسپورٹ پر تھائی لینڈ یا کسی دوسرے ملک کا ویزا نہیں لینا پڑتا۔ بلکہ ON ARRIVAL VISA مل جاتا ہے یا انٹری اور دورانِ سفر دو چار دن رُکنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ جس پر مزید ایکسٹرا پیسے بھی نہیں دینے پڑتے۔

اس بار مجھے اور مریم کو اکٹھے تھائی لینڈ رکنے کا موقع مل رہا تھا۔ سو میں نے موقع گنوایا نہیں بلکہ 4-5 دن ٹھہرنے کا پروگرام بنا ہی لیا۔ ساتھ ہی ٹکٹ والوں کی مہربانی سے ٹکٹ بھی مہنگا نہیں پڑا۔

اب پاکستان جانے اور آنے کے دوران "تھائی لینڈ" میں رُکنے کا موقع ملے گا۔ لگتا ہے کہ ابھی بھی کچھ جگہیں ایسی ہیں جہاں مجھے قسمت بلا رہی ہے۔ اور کچھ نہ کچھ نیا دکھانے کی کوشش کر رہی ہے۔

بس اب کی بار فرق صرف اتنا ہے کہ ساتھ ہمسفر دوست نہیں بلکہ بیوی ہے۔ سو یہ وزٹ کافی حد تک شریفانہ اور گھرانہ طور طریقے کا ہوگا۔ اور میری اس کتاب کے چند عنوانات کے مزید حصے پھر تشکیل ہو جائیں گے۔

مجھے بنکاک یا تھائی لینڈ جاتے ہوئے ایک انجانی سی خوشی ہوتی رہتی ہے۔ اور ایک خوشگوار سا احساس بھی۔ جو کسی اور ملک جانے پر نہیں ہوتا! اب کی بار 16 فروری سے 20 فروری 2017ء کا وزٹ مریم کے ساتھ ہوگا۔ پھر کئی جگہیں دوبارہ دیکھنے کو ملیں گی۔ جہاں کبھی دوستوں یاروں کے یا اکیلے گھومتے پھرتے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اور پھر وہی ذہن میں گئے دنوں کے احوال یہ گیت گونجنے لگے گا۔

لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے
یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

چلو قسمت پھر ایک بار وہیں لئے جا رہی ہے۔ جو کبھی نہ منزل تھی نہ ٹھکانہ تھا۔ جس راستے کا ایک پڑاؤ تھا۔

میری پیدائش کراچی کے علاقے لانڈھی معین آبادکی ہے۔ جو کافی غریب ترین علاقوں میں سے تھا۔ بچپن میں گھر کے قریب قائد آباد ٹرین اسٹیشن ہوا کرتا تھا۔ جس پر کبھی کبھار جانے کا موقع مل جاتا تھا۔ مگر دور سے ہی آتے جاتے ٹرین کو گزرتے دیکھ لیتے تھے۔

کیونکہ قریب حادثات کی وجہ سے جانا کسی خوف سے کم نہیں تھا۔ سکول بھی قریب ہی تھا۔ اس لئے روز ٹرین کا شور "چھک چھک" کی آوازیں کانوں میں گونجتی رہتی تھیں۔ مگر ایئر پورٹ جانے کا موقع کم ہی ملا کرتا تھا۔ کیوں کہ وہ گھر سے کافی دور پڑتا تھا۔ مگر کبھی کبھار ہی موقع پا کے چلے جاتے تھے۔

بالخصوص جب میرے ابا جان سعودی عرب سے آتے تھے یا جس دن واپس لوٹنے کیلئے فلائیٹ لیتے تھے۔ اُس دن ہمیں بھی ایئر پورٹ جانے کا موقع مل جاتا تھا۔ لیکن آتے ہوئے جشن کا ماحول ہوتا تھا اور جاتے ہوئے رونا دھونا۔ وہ سعودی عرب میں 19 سال تک میری پیدائش کے بعد سے 1997ء تک آتے جاتے رہے۔ ایک یا دو سال میں 2 ماہ کی چھٹیاں پا کے گھر آجاتے تھے۔ اس بہانے ہم بھی ایئر پورٹ چلے جاتے تھے۔

جہاز جونہی فضاؤں میں اُڑنے کیلئے Run Way پر بھاگنا شروع کرتا تو بہت ہی اچھا لگتا تھا۔ جب تک فلک پہ بادلوں کو چھو نہ لے آنکھیں تھکتی یا تھکتی نہ تھیں۔ اُس وقت پُرانے ایئر پورٹ سے لوگ آتے جاتے تھے۔ اور ہم ایئر پورٹ کی عمارت کے اوپر

View Gallery سے یہ سارا نظارہ دیکھتے رہتے تھے۔ دل میں ہمیشہ جہاز پر سوار ہونے اور اس کے ساتھ فضا میں اُڑنے کی خواہش کسمساتی رہتی تھی۔ مگر غریبی کے حالات اور مہنگائی کے دن رات ہمارے بڑے سے گھرانے کو اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا تھا۔ کہ باہر نہ سہی ملک میں ہی ایک شہر سے دوسرے شہر تک جہاز کی سواری کی جائے۔

ہمارا آبائی گاؤں مانسہرہ کی تحصیل اوگی میں حسین باندھ کے نام سے ہے۔ جو وادیٔ اگرور بھی کہلاتی ہے۔ کراچی سے گاؤں آنے جانے کیلئے بھی ٹرین یا بسوں کا ہی سہارا لیا جاتا تھا۔ اور آج بھی یہی سفر کا معقول ذریعہ ہے۔ ہم 1987ء میں گاؤں شفٹ ہو گئے تو پھر اسلام آباد ایئر پورٹ سے ابا جان کے آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر حالات وہی ہوتے تھے۔ بس ایئر پورٹ سے لے کر آنے اور واپس چھوڑنے کے۔ ہر بار حسرت بھری آنکھوں سے جہاز کو بس دور ہی سے دیکھ کے لطف اندوز ہو جاتے تھے۔

ابا جان اکثر گھر میں ہم سے یا اپنے دوستوں سے جہاز کے سفر کے واقعات یا انوکھے معاملات پر دیر تک بحث کرتے رہتے تھے۔ جہاز کے بارے میں باتیں سن کے بہت اچھا لگتا تھا۔ اور ہر بار تجسس بڑھ جاتا تھا۔ جی چاہتا تھا میں بھی کسی ملک جہاز پر سوار ہو کے چلا جاؤں۔

مگر نہ راستے نہ منزلیں، نہ حالات ایسے تھے کہ خواب حقیقت میں بدل سکیں۔ ہمارا علاقہ (وادیٔ اگرور) جنت کی ایک تصویر ہے مگر لوگوں کی خستہ حالی، غربت، بے روزگاری حتیٰ کہ انسانی ضرورتیں بھی پوری نہ ہو سکیں لوگ اس حسین وادیٔ کے حسن سے آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے تھے مگر شکم کی بھوک سب کو یہاں سے نقل مکانی یا ہجرت کی نوید سناتی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ یہاں کا خوبصورت قدرتی ماحول بھی ایک گھٹن کا ماحول بن چکا تھا۔

میں روز آنگن میں چارپائی پر لیٹے رات آسمان کی طرف دیکھتا رہتا تھا ستاروں سے بھرا آسمان آنکھوں میں نور ہی نور پھیلا دیتا تھا۔ پورے چاند کا عکس وادی پر سفید چاندنی کی چادر پھیلائے۔ پہاڑوں کو جگمگا دیتا تھا۔ کبھی کبھار اُن بے شمار ستاروں میں کوئی ستارہ دور تک ہلکا ہلکا چلتا دکھائی دیتا تھا۔ تب غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ وہ ستارہ نہیں کوئی جہاز ہے جو پہاڑوں سے کئی میل اوپر فضا میں اُڑ کے کسی دوسرے ملک جا رہا ہوتا تھا۔ تب پھر ایک بار وہی خواہش دھیمے سے دل میں انگڑائی لیتی تھی۔ کہ ایک بار تو جہاز میں بیٹھا جائے۔

1998 میں جب میری عمر 21 سال تھی۔ تب گاؤں میں اور علاقے میں خبر عام ہوئی تھی کہ جنوبی کوریا جانے کا موقع مل رہا ہے۔ بہت سے لوگ ڈھائی۔ تین لاکھ کسی نہ کسی ایجنٹ کو دے کر وزٹ کے بہانے نکل جاتے تھے۔ اور پھر وہیں ٹھہر جاتے تھے۔ اُس وقت جنوبی کوریا کیلئے ویزا نہیں تھا۔ بس فری انٹری تھی۔ جس کا فائدہ ایجنٹ اور علاقے کے لوگ اُٹھا لیتے تھے۔ میں بھی روز کسی نہ کسی ایجنٹ سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ جو اوروں کی طرح مجھ سے بھی ڈھائی تین لاکھ لے کر جنوبی کوریا پہنچانے کا وعدہ کر لیتا تھا۔

علاقے سے کافی لڑکے جا چکے تھے جو وزٹ کے بہانے جنوبی کوریا داخل ہو کے وہیں کسی فیکٹری میں کام شروع کر لیتے تھے۔ 50 سے 80 ہزار پاکستانی روپے تک ماہانہ تنخواہ بھی مل جاتی تھی۔ جو سن کر بہت اچھا لگتا تھا۔

فیکٹری کی جانب سے ہی رہائش اور کھانے پینے کا بندوبست بھی ہو جاتا تھا۔ اس لئے ہر کوئی اس موقع کو غنیمت جان کر دبئی، سعودی اور دوسرے ممالک کی طرح جنوبی کوریا کیلئے بھی روانہ ہو جاتے تھے۔

میرے پاس پاسپورٹ اور مزید کاغذات، حتیٰ کہ شناختی کارڈ بھی نہیں تھا۔ اس لئے مجھے کراچی جانا پڑا۔ کیونکہ امی ابا کے تمام کاغذات وہیں کے تھے سو میرا ریکارڈ بھی وہیں موجود تھا۔ میں کراچی کاغذات بنانے چلا آیا۔ اور موقع کو غنیمت جان کر گھر والوں سے ضد کی کہ مجھے بھی جنوبی کوریا جانا ہے۔ بہت سی سفارشات کے بعد ابا جان راضی ہو گئے۔ اور مجھے جانے کیلئے پیسے دینے پر آمادہ ہو گئے۔ سو میں نے پاسپورٹ بنا کے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ مگر کوئی راستہ مجھے بہتر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتفاق سے اُنہی دنوں میں میرے ایک ماموں ''علی اصغر'' جو امی کے چچا زاد بھائی تھے۔ اور وہ تین سال پہلے تھائی لینڈ اور تھائی لینڈ سے سرحد پار کر کے ملائیشیا پہنچے تھے۔ جہاں اُنھوں نے دو تین سال مزدوری کی تھی۔ اور پھر پکڑے جانے پر ایک ماہ ڈیٹنشن سنٹر میں رہنے کے بعد پاکستان واپس آ چکے تھے۔ وہ بھی جنوبی کوریا کے بارے سن کے پھر رخت سفر باندھ کے دوسری بار کیلئے نکل پڑے تھے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی۔ اور ساتھ جانے کا ارادہ بن گیا۔

اُن کا کہنا تھا کہ ''تھائی لینڈ'' وزٹ ویزے (Visit Visa) پر جائیں گے۔ جہاں سے ہمیں ایک ایجنٹ کے ذریعے جنوبی کوریا جانے کا موقع مل جائے گا۔ وہ ایجنٹ کافی جان پہچان والا ہے۔

اگر ایسا نہ بھی ہوا تو کوئی اور ہمیں پاکستانی یا کسی دوسرے ملک کے نقلی پاسپورٹ پر ''جنوبی کوریا'' تک پہنچا دے گا۔ اور خرچہ بھی پاکستان کی بہ نسبت کم ہو گا۔

اُن کے کہنے پر میں راضی ہو گیا۔ اور اُنہی کے جان پہچان کے ایک ٹریول ایجنٹ نے دو تین دنوں میں ''تھائی لینڈ'' کا وزٹ ویزا لگوا دیا۔ ساتھ ہی ٹکٹ بھی بک کر لیا۔

جس دن پاسپورٹ پر ویزا لگ کے واپس ملا۔ اُسی رات ہم نے کراچی سے بنکاک روانہ ہونا تھا۔

جلدی سے شاپنگ وغیرہ کی اور رات گئے ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ اُس دن پہلی بار ایئر پورٹ کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا اور جہاز میں سوار ہونے کا چانس بھی۔

دل میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ جیسے ایک زمانہ بعید سے دیکھتے آ رہے تھے۔ آج اُس پر سوار ہونے کا دن آ چکا تھا۔ بڑے جوش و خروش سے ہم جناح ٹرمینل میں داخل ہوئے۔

خوش اخلاق مہذب اقوام کا شیوہ

تابندہ ضیا/لاہور

کویت انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر امریکہ جانے والی پرواز کے اڑان بھرنے کا وقت قریب آن پہنچا تھا۔ اناؤنسر کے اعلان کے ساتھ ہم بھی متعلقہ چیک ان کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئے۔ دستی سامان کی جانچ پڑتال والی قطار میں ہم سے آگے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی ایک بچی تحمل سے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ وقت گزاری کی غرض سے ہم نے اس کے رخسار کو محبت سے چھو کر اس کا نام معلوم کیا۔ بچی نے مسکرا کر پہلے ہمیں ہیلو کہا اور اپنا ننھا سا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ سامان کی جانچ کے بعد انتظار گاہ میں بیٹھے تو اپنے لیپ ٹاپ پر انٹرنیٹ کے حصول کے لیے وائی فائی پاس ورڈ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ارد گرد کے جائزہ لیا تو نزدیک ہی وہ نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والا خاندان براجمان تھا۔ صاحب خانہ اپنے ٹیبلٹ کے ذریعے غالباً انٹرنیٹ استعمال کر رہے تھے ہم ان کی جانب دیکھ ہی رہے تھے کہ انہوں نے نرم لہجے میں خود ہم سے پوچھا۔ "Do you need any help" اور ہمارے استفسار پر وائی فائی کا پاس ورڈ ہمیں بتلایا۔ بعدازاں پھر ہم سے دریافت کیا کہ انٹرنیٹ صحیح کام کر رہا ہے یا نہیں۔

اس خاندان سے مختصر تعارف کے بعد ہم جہاز میں اپنی نشست پر پہنچے تو یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ہماری نشست ان سے ملحقہ تھی۔ دل میں جو بارہ گھنٹے کے طویل سفر کا خوف تھا، اس کا نصف تو ان کے مسکراتے ہوئے چہرے دیکھتے ہی زائل ہو گیا دوران پرواز خاتون خانہ نے بتلایا کہ ان کے شوہر نامدار امریکا سے تعلق رکھنے والی ایک عیسائی مشنری سے وابستہ ہیں اور ان دنوں مشنری کی جانب سے تھائی لینڈ کے صوبے chaing mai میں عیسائیت کا پرچار کر رہے ہیں۔ اور ایک مقامی اسکول میں انگریزی کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ یہ خاتون جب بھی اپنے بچوں کے لیے دستی بیگ سے چاکلیٹ یا ٹافیاں نکالتیں، ہمیں ضرور دعوت دیتیں۔ ایک جگہ خراب موسم کے پیش نظر جہاز کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے لگے جو بکثرت ہوائی سفر کرنے والوں کے لیے تو معمول کی بات تھی مگر ہمیں شدید خوف نے آ لیا۔ ہمارے فق چہرے دیکھ کر خاتون خانہ نے محبت سے ہمارا ہاتھ تھام کر میٹھے لہجے میں سمجھایا۔

"Dont worry, it will be alright. Just think tha plane is taking you a ride".

جان ایف کینیڈی ایئر پورٹ پر سامان Conveyer belt سے اتارتے وقت بھی صاحب خانہ نے ہماری بھرپور مدد کی اور ہمارے بھاری سوٹ کیس خود ہی اٹھا کر ٹرالی میں رکھ دیے۔ تینوں بچوں نے باقاعدہ بغلگیر ہو کر ہمیں الوداع کیا۔

اس خاندان سے گو کہ دس گھنٹے پر محیط یہ ایک مختصر تعارف تھا مگر ان کے رویے اور اخلاق نے ہمارے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے۔

ہمارا مذہب اسلام بلاشبہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جو احکامات اللہ نے لوح محفوظ میں بارہا بیان کیے ہیں اس میں خوش اخلاق کا درس بھی شامل ہے۔ قرآن مجید اور احادیث رسولؐ میں متعدد جگہوں پر ہمیں اقرباء اور اغیار سے اچھے طریق پر پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سورۃ آل عمران میں اللہ تبارک تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد وپیش سے چھٹ جاتے"

حدیث نبویؐ ہے "تم میں سے بہترین وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔"

رسول پاکؐ نے بہترین اخلاق اور عمدہ کردار کی اہمیت پر یوں بھی روشنی ڈالی۔ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں جب تک اس کے ہاتھ اور زبان سے اس کا مسلمان بھائی محفوظ نہ ہو"

اسلامی تاریخ اور نبی آخر الزماںؐ کی سوانح حیات ایسے ان گنت واقعات سے پُر ہے جہاں بار بار مومنوں کو خوش اخلاق اور نرم خوئی کا سبق پڑھایا گیا ہے۔ رسول پاکؐ کا کفار کے ساتھ حُسن سلوک، دشمنوں کی خطاؤں کو خوش دلی سے معاف فرمانا، ترش سے تلخ بات بھی صبر کا گھونٹ پی کر سہہ جانا، اور ایسے کئی واقعات بارہا ہماری نظر سے گزرتے رہتے ہیں مگر یہ امر نہایت افسوس طلب ہے کہ ہماری قوم نے

بھی اس اسوۂ حسنہ پر پوری طرح عمل پیرا نہیں۔

تعلیمی ادارے ہوں یا کھیل کے میدان، بازار و تفریح گاہیں ہوں یا دفاتر، ہر جگہ معمولی سی بات پر شور و غوغا مچانا، ایک دوسرے کا گریبان پکڑ لینا اور نازیبا کلمات منہ سے نکالنا روز کا معمول بن چکا ہے۔ چھوٹی سی بات کا یوں بتنگڑ بنتا ہے کہ لوگ لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ہتھیار نکل آتے ہیں، ہاتھا پائی شروع ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تو نوبت خون خرابے تک آ جاتی ہے۔

چند یوم قبل ہمارے دفتر میں ایک اچھے خاصے معقول آفیسر Peon کی معمولی سے خطا پر تیخ پا ہو گئے اور اسے بے نقط سنا ڈالیں بے چارے Peon کا قصور صرف اتنا تھا کہ صاحب کو چائے پیش کرتے وقت وہ کپ کے نیچے پرچ رکھنا بھول گیا تھا۔ اتوار بازار میں گزشتہ ہفتے بھاؤ تاؤ پر بحث کے طول پکڑنے پر ایک صاحب نے سبزی فروش کا ٹھیلا اُلٹنا چاہا جسے دیکھ کر ذو یکی دکاندار اکٹھے ہو گئے اور نوبت دھینگا مشتی تک پہنچ گئی۔

یہ بات تو متعدد تحقیقات سے بخوبی ثابت ہو چکی ہے کہ طیش کی حالت میں ہمارے جسم میں موجود چند ہارمونز کی رطوبتیں بڑھ جاتی ہیں جو بلند فشار خون اور ذیابیطس جیسے موذی امراض کا سبب بنتی ہیں۔ ان تمام امور سے بخوبی آگاہ ہونے کے باوجود بھی غصہ، بد اخلاقی، بدزبانی کسی ناسور کی طرح ہمارے معاشرے میں سرایت کر رہے ہیں۔ غیر مسلم معاشروں نے ہمارے اسلاف سے جو اقدار سیکھیں، ان میں سرفہرست خوش اخلاقی ہے جس کی بدولت وہ مہذب اقوام کہلائے جاتے ہیں۔ اجنبیوں سے مُسکرا کر بات کرنا، سلام میں پہل کرنا، حال احوال دریافت کرنا ہماری دینی تعلیمات کا اہم حصہ تھا جسے ہم نے تو فراموش کر دیا اور انہوں نے اپنا رہنما اصول بنا لیا۔

رسول پاکؐ کے اعلیٰ اقدار اور اخلاق کی بدولت ہی اسلام نہایت قلیل عرصہ میں پورے جزیرہ ہائے عرب میں پھیلا۔ آج اس نفسا نفسی کے دور میں ضرورت اس امر کی ہے کہ سیانوں کے پڑھائے اس سبق کو عملی زندگیوں میں اختیار کیا جائے۔ تاکہ ہماری آنے والی نسلیں دنیا میں مُسکراہٹیں بکھیرنے کا سبب بنیں۔ اور ہم بھی مہذب معاشروں کی صف میں شامل ہو جائیں۔

اس خواب کی تعبیر کے لیے پہلی اینٹ شخصی بنیاد پر رکھی جائے گی۔ مجھے اور آپ کو آج ہی سے یہ عہد ہم کرنا ہو گا کہ ہم اپنے روزمرہ معمولات میں بدزبانی اور تنگ مزاجی سے پرہیز کریں گے۔ اپنے مسائل خوش اخلاقی سے حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ یقین جانیے، ٹھنڈے دماغ سے بغیر غم و غصہ سے رہا جائے تو گھمبیر سے گھمبیر مسئلے کا حل بھی خوش اسلوبی سے نکل آتا ہے۔

ایک مُسکان سے ہمارے جسم اور دماغ پر پڑنے والے مثبت اثرات پر بھی تحقیق کے ذریعے دنیا میں سینکڑوں اسکالر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے چکے ہیں۔ اس عادت کو اپنانے سے نہ صرف ہم ایک مہذب قوم گردانے جائیں گے بلکہ روزمرہ کے وہ مسائل جن کی بناء پر فسادات نسل در نسل چلتے رہتے ہیں۔ امن و سکون سے بخوبی حل ہو جائیں گے۔

اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

محمد ادریس لاہوری / اوسلو، ناروے

عداوت کرنے والوں کو عداوت یاد رہتی ہے
محبت کرنے والوں کو محبت یاد رہتی ہے
بھلا دینے کی کوشش تو بہت کرتا ہوں صبح و شام
مگر کچھ درد ہیں جن کی اذیت یاد رہتی ہے
فقط میں دیکھتا کب ہوں اُسے پڑھتا ہی ہوں ہر پل
کسی سورت کی طرح اس کی صورت یاد رہتی ہے
بچھڑنا جس نے ہوتا ہے بچھڑ جاتا ہے آخر کار
گزرتی ہے جو اس دل پر وہ حالت یاد رہتی ہے
خلوص دل سے ہو جب بھی اُسے ہے بھولنا مشکل
کہ خاطر یاد رہتی ہے مدارت یاد رہتی ہے
خریداری میں بیش و کم بھی ہونے نہیں دیتے
کہ جس پہ کوئی بکتا ہے وہ قیمت یاد رہتی ہے
فقط یہ دوست ہیں جو بھول جاتے ہیں محبت کو
مگر ادریس دشمن کو رعایت یاد رہتی ہے

....

جو دار کے تھے قابل سردار بن گئے ہیں
میرے وطن کی خاطر آزار بن گئے ہیں
مجرم تھے جتنے اب وہ سیاست کے پیشوا ہیں
شہ سرخیوں میں آ کر شہکار بن گئے ہیں
جب تک رہی حکومت کرتے رہے کرپشن
پکڑے گئے ہیں اب تو بیمار بن گئے ہیں
کردار جن کا کوئی تھا ہی نہیں یہاں پہ
اب وہ یہاں مثالی کردار بن گئے ہیں
ہر اک بلیک میلر کا ہے بلیک میلر
چینل بنے ہیں کیا کیا، اخبار بن گئے ہیں
سب کچھ اُلٹ پلٹ کے اب رکھ دیا گیا ہے
جو پھول تھے ہمارے وہ خار بن گئے ہیں
جیسا بھی تھیچ ہوگا اب جیتنا ہے مشکل
ہم لوگ اپنی خاطر خود بار بن گئے
کاغذ پہ یونہی لکھے میں نے پھپھولے دل کے
ادریس میں ہوں حیراں اشعار بن گئے ہیں

خاندانی بہو

محمد ایوب صابر/سعودی عرب

دن بھر تپش سہنے کے بعد سورج نڈھال ہوکر شام کی آغوش میں چھپنے کی تیاری کر رہا تھا، گاؤں کی زندگی میں عجیب ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ پرندے جو صبح دانہ دُنکا چگنے اپنے گھونسلوں کو خیر باد کہہ کر گئے تھے، وہ پیٹ بھر کے گھر لوٹ رہے تھے۔ اُن کی آوازیں ماحول میں جلترنگ پیدا کر رہی تھیں۔ مویشی چراگاہ سے لوٹ رہے تھے، اُن کے گلے میں بندھے گھنگرو اور گھنٹیاں ایک مترنم ساز پیدا کر رہی تھیں۔ ایک ایسا ساز جو کانوں میں رس گھول دیتا۔ چرواہے مویشیوں کو ہانکنے کے ساتھ لوک گیت گا کر گاؤں کی زندگی میں سدا بہار دلکشی کو زندہ رکھنے پر مائل تھے۔

گاؤں کے مضافات میں رنگ برنگے کپڑے پہنے بچے ٹاہلی کے نیچے بندر کلّہ کا آخری داؤ لگا رہے تھے۔ ایک طرف بندر کلّہ اپنے آخری مراحل میں تھا تو دوسری طرف کوکلا چھپاکی کھیلنے والے دھول سے اٹے چہروں والے بچے بھی آخری پھیرے میں تھے۔ جس بچے نے کل زور کا کوکلا مارا تھا آج اُس کو پورے زور سے کوکلا مار کر حساب برابر کرنا تھا۔ لڑکیاں بھی اشاپو کی آخری باری کو جلدی ختم کرنے کی فکر میں گلے میں پڑے پٹی نما دوپٹے کو بار بار سنبھال رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ سورج غروب ہونے سے پہلے گھر پہنچ کر چھوٹے بچے کی دیکھ بھال کریں گی تاکہ ماں شام کا کھانا بنا سکے۔ بچوں کے یہ تمام کھیل گاؤں کی زندگی کا لازمی جزو تھے۔ گاؤں کا سارا انتظام خودکار مشین کی طرح اپنے آپ چل رہا تھا۔

شام ہو گئی تھی، گاؤں کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آ چکا تھا۔ گلیوں میں اندھیرے کا راج قائم ہو رہا تھا۔ سمن آباد گاؤں کی ساری توجہ کا مرکز چوپال تھا۔ وہ چوپال جو سارا دن ویران نظر آتا تھا، اب ساری رونق کا ٹھکانہ بن گیا تھا۔ چوپال میں ایک دائرے کی شکل میں چار پائیاں لگ چکی تھیں۔ ایک بڑا سا پلنگ جس پر ڈبے والا کھیس بچھا کر سرخ تکیہ رکھا ہوا تھا، وہ خالی رہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ تمام چار پائیوں پر لوگ اپنے ہم مزاج لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ حیدر نائی نے ہر حقّے میں تازہ چلم بھر کے ہر ایک چار پائی کے پاس ایک ایک حقہ رکھ دیا۔ محفل کی جان جھورا میراثی ابھی تک نہیں آیا۔ سب جانتے تھے کہ چودھری بشیر احمد کے آنے سے پہلے جھورا پہنچ جائے گا۔ جھورا جانتا تھا کہ اگر جلدی آ گیا تو کام میں حیدر کا ہاتھ بٹانا پڑے گا۔ اسی لئے وہ اپنے مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ چودھری بشیر احمد اپنے نوکر باؤ کی رہنمائی میں تشریف لا رہے تھے۔ چوپال میں جمع لوگوں نے یک زبان ہو کر آواز لگائی "چودھری صاحب آ گئے" سب نے کھڑے ہو کر چودھری صاحب کا استقبال کیا۔ باؤ نے آگے بڑھ کر کندھے سے پرنا اتار کر چودھری کے پلنگ پر احتیاط سے جھاڑا مارا۔ وہ جانتا تھا کہ حیدر نائی چودھری بشیر احمد کا پلنگ لگانے کے بعد کھیس اچھی طرح جھاڑ پھٹک کر بچھاتا تھا لیکن چودھری کے ساتھ اپنی ازلی وفاداری تازہ کرنے کے لئے باؤ روزانہ یہ عمل دہراتا، جس کے بدلے اُسے چودھری کی ایک مسکراہٹ عطا ہوتی جو کسی انعام سے کم نہیں تھی۔

سیالکوٹ کے نواحی گاؤں سمن آباد کا چودھری بشیر احمد ایک شریف النفس اور خاندانی آدمی تھا۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے احساسات کو سمجھتا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر روزانہ نہ صرف وقت گزارتا بلکہ گاؤں کے مسائل کا حل بھی تلاش کرتا تھا۔ سمن آباد اور آس پاس کے دیہاتوں میں رسم و رواج کے لحاظ سے تقریباً مماثلت تھی صرف ایک عمل ایسا تھا جس میں سمن آباد کے باسیوں کو انفرادیت حاصل تھی۔ چودھری بشیر احمد کے ننھیال صوبہ سندھ میں تھے اور وہاں چوپال میں سجنے والی "کچ کچہری" سمن آباد کی معاشرت کا حصہ بن گئی تھی۔ سمن آباد کے چوپال میں سردیوں کے موسم میں شام ہوتے ہی آگ جلا دی جاتی تھی۔ اس کچ کچہری میں ہر عمر کے لوگ چوپال کے مرکز میں جلائی ہوئی لکڑی کی آگ پر ہاتھ سینکتے، آگ سینکنے والوں کے چہرے بھی آگ کی لو میں سرخی مائل نظر آتے۔ ہاتھ تاپتے ہوئے جھورے میراثی کی پُرسوز آواز میں ہیر وارث شاہ سننا ایک لطف اندوز مرحلہ ہوتا۔ جب لوگ جھورے کی جگتوں سے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تو مزاج بدلنے کے لئے چودھری بشیر احمد نے فرمائش کرتے کہ جھورے کو ہیر وارث شاہ سنانے

حکم دیا جائے۔ چودھری صاحب خود بھی ہیر وارث شاہ کے دیوانے تھے۔ وہ جھورے کو کہتے "جھتیں بہت ہو گئیں ذرا ہیر وارث شاہ کا راگ چھیڑو" اُس کا چھوٹا بھائی نورا بانسری کے سُر سنبھال لیتا اور جھورے کی آواز کا جادو شروع ہو جاتا، وہ خود بھی گاتے ہوئے مسرور کیفیت میں چلا جاتا۔ جھورے کی آواز اور بانسری کے سُر ماحول کو سحر انگیز بنا دیتے، تمام سامعین سر دُھن رہے ہوتے۔ جھورے کا گلا گاتے ہوئے اور نورے کے ہونٹ بانسری میں سُر پھونکتے ہوئے جب تھک جاتے اُس وقت تک رات کا پورا پہر گزر چکا ہوتا؛ کسی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ محفل اختتامی لمحات کی طرف بڑھ چکی تھی۔ چودھری بشیر احمد جب ہاتھ کے اشارے سے جھورے کو اختتام کا حکم دیتے تو چوپال سے محفل برخاست کر دی جاتی اور تمام لوگ خوشگوار موڈ میں ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہوئے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔

چودھری بشیر احمد کا اکلوتا بیٹا رشید احمد اور بیٹی بلقیس زہرہ جوان ہو چکے تھے۔ چودھری کی بیوی مہر النساء اب وقتاً فوقتاً اُسے یاد دلاتی کہ کوئی اچھے سے رشتے دیکھ کر بچوں کی شادیاں کر دی جائیں۔ چودھری بشیر احمد چاہتا تھا کہ پہلے بیٹے کی شادی کر دی جائے تاکہ بیٹی کی رخصتی سے پہلے بہو گھر آ جائے۔ اُس نے ایک دن قریبی گاؤں کمال پور کے رہائشی دوست حیات محمد سے بات کی "میں اپنے بیٹے کے لئے رشتہ تلاش کر رہا ہوں کوئی اچھا رشتہ تمھاری نظر میں ہو تو ضرور آگاہ کرنا۔"

"آپ گاؤں کے چودھری ہیں، آپ کو رشتے تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گاؤں کی جس لڑکی سے اپنے بیٹے کا رشتہ طے کرنا چاہو گے، اُس کے والدین راضی ہو جائیں گے۔" حیات محمد نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"تمھاری بات بالکل درست ہے لیکن میں کسی خاندانی لڑکی کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں۔" چودھری نے جواب دیا۔

اسی تلاش میں ایک دن چودھری بشیر احمد کریم آباد گاؤں پہنچ گیا۔ اُسے موسم کی شدت کی وجہ سے پیاس محسوس رہی تھی وہ پانی کی تلاش میں ایک حویلی کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ نوکر نے دیکھا کہ کوئی تھکا ہارا اجنبی مسافر گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام تھام لی اور اُسے حویلی کے اندر لے آیا۔ اُس نے گھوڑے کو تھان پر باندھ دیا اور حویلی کے اندر جا کر اپنے مالک کو اطلاع دی" کوئی پردیسی آدمی آیا ہے، مجھے تھکا ہوا لگا اس لئے اُسے اندر لے آیا ہوں۔" حویلی کے مالک چودھری محمد اعظم نے کہا کہ اُس آدمی کے لئے کوئی لسی پانی کا انتظام کرو اور خود لان میں چودھری بشیر احمد سے ملنے آ گئے۔ دونوں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ چودھری محمد اعظم نے لسی پانی سے فارغ ہو کر نوکر کو حکم دیا" کھانے کا وقت ہے، اس لئے کھانے کا بندوبست کرو۔" چودھری بشیر احمد نے اپنا تعارف کروایا" میں سمن آباد کا چودھری ہوں اور کریم آباد پہلی دفعہ آیا ہوں۔" کھانے سے فارغ ہو کر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ چودھری بشیر احمد کو لگا کہ جس خاندان کی تلاش میں تھا وہ اُسے مل گیا۔ اُس نے چودھری محمد اعظم سے اپنا مدعا بیان کیا۔ چودھری محمد اعظم بھی اپنی جوان بیٹی صفیہ سلطانہ کی شادی کے لئے فکرمند تھا۔ اُس نے فوراً رشتے کے لئے ہاں کر دی، اور جلد شادی کی تاریخ رکھنے پر اتفاق ہو گیا۔

چودھری بشیر احمد نے گاؤں واپس آتے ہوئے راستے میں کمال پور مختصر قیام کیا اور حیات محمد کو اپنے بیٹے کا رشتہ طے کرنے کی خوشخبری سنائی۔

"میری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔" حیات محمد نے خوش ہو کر کہا۔

چودھری بشیر احمد سمن آباد روانہ ہو گیا۔ اُس نے گھر آ کر مہر النساء کو مبارکباد دی" میں نے ہمارے بیٹے کا رشتہ کریم آباد کے چودھری محمد اعظم کی بیٹی صفیہ سلطانہ سے طے کر دیا ہے۔" مہر النساء خوش ہو گئی۔ چند دنوں بعد تاریخ طے ہوئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بلقیس زہرہ نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر حویلی کے زنان خانے میں ڈھولک رکھ لی تھی، لڑکیوں نے مہندی لگا کر ہاتھوں کی ہتھیلیاں سرخ کر لیں اور پھیری ڈال کر دھرتی ہلا دی۔ شادی کے دن سمن آباد میں جشن کا سماں تھا، حویلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ چودھری بشیر احمد کے بھائی بہنیں اور تمام برادری کے لوگ اپنے اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ شادیانے بج رہے تھے۔ ڈھول کی تھاپ پر لوگ بھنگڑا ڈال رہے تھے جنہیں دیکھ کر ہر ایک چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا، ایسے میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

چودھری بشیر احمد کی حویلی میں شادی کی رونق اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ چودھری نے آج اونچے شملے کی تلّے دار کُلّے والی پگ باندھی تھی۔ اُس

دوران پولیس کی وردی میں ملبوس ایک سپاہی چودھری بشیر احمد کے پاس آیا اور بلند آواز میں کہا" چودھری صاحب! آپ پر قریبی گاؤں کے ایک آدمی کو قتل کرنے کا الزام ہے اور میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔" ایک لمحے میں پورا منظر بدل گیا، اس بات کو سن کر شہنائی کی آواز بند ہوگئی، ڈھول کی تھاپ رک گئی اور ہر ایک کا چہرہ اتر گیا۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے اشاروں میں پوچھ رہا تھا" کیا ہو رہا ہے؟" چودھری بشیر احمد چونکہ قانون پسند آدمی تھے، انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی نصیر احمد کو حکم دیا "اب شادی کے تمام انتظامات تمھارے ہاتھ میں ہیں، میں پولیس کے ساتھ تھانے جا رہا ہوں۔" وردی میں ملبوس سپاہی نے دیکھا کہ معاملہ زیادہ سنگین ہوگیا۔ اُس نے فوراً پینترا بدلا اور ہاتھ جوڑ کر کہا" چودھری صاحب! میں بہروپیا ہوں اور خوشی کے موقع پر لاگ لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں، جوڑیاں سلامت رہیں، مجھے بیٹے کی خوشی پر لاگ دے دیجئے۔"

ساری حویلی میں ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے۔ چودھری بشیر احمد نے بھی ہنستے ہوئے 10 روپے کا نوٹ نکال کر بہروپیے کو دے دیا جو دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوگیا اور خوشی کی تان جہاں سے ٹوٹی تھی وہیں سے دوبارہ جڑ گئی۔

بینڈ باجے کے ساتھ برات کریم آباد کے لئے روانہ ہوئی۔ جب برات کمال پور پہنچی تو حیات محمد نے اپنے دوست کے بیٹے کی برات کو خوش آمدید کہا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں براتیوں کو دودھ پلانے کا انتظام کرنا چاہتا ہوں۔ چودھری بشیر احمد نے کہا" حیات محمد! اگر اس طرح راستے میں قیام کیا تو کریم آباد پہنچنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ برات کے ساتھ بھوکے ہیں، جلدی سے اُن کو دودھ پلا دو تو ہم روانہ ہو جائیں گے۔" حیات محمد گھر گیا اور اپنی بیوی سے کہا" کاڑھنی نکالو مجھے چودھری کے کتوں کو دودھ پلانا ہے۔" بیوی نے صاف انکار کر دیا اور کہا" ہمارے گھر اپنے لئے دودھ ہے، چودھری کے کتوں کے لئے دودھ نہیں مل سکتا۔" حیات محمد نے اپنی عزت بچانے کے لئے آگے بڑھ کر خود کاڑھنی اٹھائی تو بیوی نے دوسری طرف سے کاڑھنی پکڑ لی، حیات محمد اور اُس کی بیوی کے درمیان کھینچا تانی شروع ہوگئی۔ حیات محمد کا جوان بیٹا اسد محمد یہ سارا کھیل خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ چودھری بشیر احمد بھی اپنے گھوڑے پر سوار اس صورتحال کو دیکھ رہا تھا، اُس نے آواز دی" حیات محمد! آ جاؤ، دیر ہو رہی ہے، کریم آباد جا کر دیکھیں گے۔"

کریم آباد میں برات کا شایانِ شان طریقے سے استقبال کیا گیا۔ آتش بازی اور ڈھول ڈھمکے کا مظاہرہ ہوا۔ ملنی کے موقع پر جھورے نے چودھری بشیر احمد کا شجرہ سنایا۔ دونوں طرف سے پگ کے تبادلے ہوئے۔ باراتیوں کو انواع و اقسام کے پکوان پیش کیے گئے۔ اس موقع پر علاقے کے سب میراثی اپنی جگتوں سے براتیوں کے دل لبھانے میں مصروف تھے تاکہ لاگ میں زیادہ سے زیادہ پیسے مل سکیں۔ ہر گاؤں میں کوئی ایک رسم ایسی ہوتی ہے جو اُس گاؤں کی پہچان ہوتی ہے۔ کریم آباد میں بھی ایک رسم تھی کہ وہاں جو بھی برات آتی اُسے تیراندازی کا مظاہرہ کرنا ضروری ہوتا۔ رشید احمد کی برات کے موقع پر بھی براتیوں سے کہا گیا کہ تیر اور کمان حاضر ہے آپ مقررہ ہدف پر نشانہ لگائیں گے۔ ڈھول کی تھاپ پر برات اور کریم آباد کے لوگ ایک پنڈال میں جمع ہوگئے۔ 50 فٹ کے فاصلے پر ایک پتلا زمین میں گاڑھ کر اُس کے سر پر ایک سیب رکھ دیا گیا۔ تیراندازوں کو نشانہ لگا کر اس سیب کو پتلے کے سر سے گرانا تھا۔ یہ کمن آباد والوں کی عزت کا سوال تھا۔ چودھری بشیر احمد نے باؤ سے کہا" تیراندازی شروع ہونے سے پہلے اعلان کر دو، جو نوجوان آج سیب پر نشانہ لگائے گا اُسے چودھری کی حویلی سے ملحقہ ایک ایکڑ زمین انعام کے طور پر دی جائے گی۔" نوجوانوں میں کافی جوش و خروش تھا۔ بالآخر پانچ نوجوان تیراندازوں کا انتخاب کیا گیا۔

پہلے تیرانداز کا تیر پتلے کے سر کو چھوتا ہوا بائیں جانب سے گزر گیا۔ کمن آباد والوں میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ دوسرے تیرانداز کا تیر دائیں طرف سے گزرا، باقی تین کا بھی نشانہ خطا گیا۔ براتیوں کے چہرے اتر گئے۔ چودھری بشیر احمد نے ایک غیر متوقع فیصلہ کر لیا تھا، اُس نے اپنے سر سے پگ اتار کر باؤ کے ہاتھ میں دے دی۔ لوگوں نے آج برسوں بعد چودھری کو ننگے سر دیکھا تھا۔ ساری برات کے سر شرم سے جھک گئے۔ وہ جانتے تھے اب ڈولی کریم آباد والوں کی شرائط پر ہی اٹھائی جائے گی۔ سب کے چہرے پر پریشانی کے گہرے بادل چھا گئے۔ ڈھولچی نے اپنے گلے سے ڈھول اتار دیا جو ایک طرح سے مات کا اعلان تھا۔

اچانک چودھری بشیر احمد نے چیتے کی پھرتی دکھاتے ہوئے تیر کمان اپنے ہاتھ میں لے کر برات میں نئی روح پھونک دی۔ براتیوں کے اترے ہوئے چہرے کھل اٹھے، سمن آباد کے بزرگ جانتے تھے کہ چودھری بشیر احمد جوانی میں ایک نامور تیر انداز اور شمشیر زنی کے ماہر تھے۔ ڈھولچی نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ڈھول دوبارہ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ وہ اس طرح جوش اور جذبے سے ڈھول بجانے لگا گویا آج ڈھول پھاڑ دے گا۔ نوجوانوں نے بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔ چودھری نشانہ لگانے کے مقام پر فاتحانہ انداز میں ڈگ بھرتا ہوا پہنچ گیا۔ براتیوں کی گویا سانسیں ہی رک گئی تھیں۔ ہر کوئی آنکھ جھپکنا بھول گیا۔ چودھری نے بسم اللہ پڑھ کر تیر چھوڑا، تیر ہوا میں تیرتا ہوا ایک ہی آن میں پتلے کے سر پر رکھے سیب پر ایسا لگا کہ سیب تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر ہوا میں اُچھل گیا۔ نوجوانوں نے نعرہ مار کر سمن آباد والوں کی کامیابی کا اعلان کر دیا۔ کریم آباد کے لوگ بھی خوشی سے جھوم اٹھے۔ چودھری محمد اعظم آگے بڑھا اور باڑے سے پگ لے کر اپنے ہاتھوں چودھری بشیر احمد کے سر پر رکھ دی۔

دن ڈھلنے لگا تھا، اب برات کی واپسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چودھری محمد اعظم نے نم آنکھوں کے ساتھ صفیہ سلطانہ کو ڈولی میں بٹھا دیا، کہاروں نے ڈولی اٹھائی۔ بیٹی باپ کا آنگن چھوڑ کر پیا کے دیس سدھار رہی تھی۔ صفیہ سلطانہ کی تمام سکھیوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔ برات واپس روانہ ہو گئی۔ چودھری بشیر احمد نے حیات محمد کو ایک طرف بلا کر کہا ”جب برات تمہارے گاؤں پہنچے تو بلند آواز میں اعلان کرنا کہ چودھری تم نے میرا جو قرض دینا ہے وہ ابھی واپس کرو ورنہ میں برات آگے نہیں جانے دوں گا۔“ حیات محمد حیران ہو گیا کہ چودھری بشیر احمد نے کیسے امتحان میں ڈال دیا۔ اُس نے حیرت سے کہا ”چودھری یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ چودھری بشیر احمد نے کہا ”جیسا میں نے کہا ویسا ہی کرو اس کا مطلب میں تمہیں بعد میں سمجھاؤں گا۔“ لہٰذا طے شدہ منصوبے کے تحت برات جب کمال پور پہنچی تو حیات محمد نے بلند آواز میں کہا۔

”چودھری آپ نے میرا جو قرض دینا ہے، وہ ابھی ادا کرو، ورنہ میں برات آگے نہیں جانے دوں گا۔“

برات پر سراسیمگی طاری ہو گئی، کہاروں نے ڈولی رکھ دی۔ صفیہ سلطانہ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے نوکر سے پوچھا ”کیا وجہ ہے، ڈولی کیوں رکھ دی گئی اور برات کیوں رک گئی ہے؟“ نوکر نے بتایا ”ایک آدمی نے آپ کے سسر سے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا ہے ورنہ برات آگے نہیں جا سکتی۔“ صفیہ سلطانہ نے اپنے تمام زیورات اتارے اور سلامی کے تمام پیسے ملا کر ایک پوٹلی نوکر کو دی اور کہا ”میرے سسر سے کہو کہ اس زیور اور پیسوں سے رقم کی ادائیگی فوراً کر دی جائے اور اگر اس کے بعد بھی قرض باقی ہے تو تم کریم آباد جاؤ اور میرے والد سے پیسے لے کر آؤ۔ یہ قرض ابھی ادا ہو گا۔ اس برات کو کوئی نہیں روک سکتا۔ میرے والد نے جو پگ اپنے ہاتھوں میرے سسر کے سر پر رکھی ہے، اس پگ کا شملہ اونچا ہی رہے گا۔“

چودھری نے اپنی بہو کا زیور اور پیسے واپس کر دیئے اور کہا ”اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ برات سمن آباد کے لئے روانہ ہوئی۔ ہر زبان پر صفیہ سلطانہ کے خاندانی وقار کا تذکرہ تھا۔ اُس نے ثابت کر دیا کہ اصلی زیور اس کے خاندان کی عزت تھی جسے محفوظ رکھنے کے لئے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔ چودھری بشیر احمد کا سر بھی فخر سے بلند ہو گیا، وہ انتہائی خوش تھا کہ اُسے خاندانی بہو مل گئی۔ صفیہ سلطانہ کو حویلی میں شاندار انداز میں خوش آمدید کہا گیا۔

چند روز بعد چودھری بشیر احمد نے حیات محمد کو اپنی حویلی بلایا اور اُسے یاد دلایا کہ تم نے ایک دن کہا تھا ”گاؤں کی کسی بھی لڑکی کو اپنی بہو بنا لو لیکن مجھے خاندانی بہو کی تلاش تھی جو میرے خاندانی وقار کو اگلی نسل تک لے کر جائے۔“ اس نے حیات محمد سے کہا ”تم نے اپنی بیوی سے دودھ کی کاڑھنی مانگی لیکن اس نے دینے سے انکار کر دیا حالانکہ تم دونوں 25 سال سے ایک ساتھ رہ رہے ہو۔ اس کے برعکس میری بہو نے میرے گھر آنے سے پہلے ہی اپنا تمام زیور اتار کر دے دیا اس کے باوجود کہ خواتین زیور سے بہت پیار کرتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے ایک خاندانی لڑکی کو اپنی بہو بنا کر خاندان کی بنیاد مضبوط کر لی۔ اب میں تمہارے گھر کا ماحول بھی تبدیل کر دوں گا۔ میں اپنی بیٹی بلقیس زہرہ کا رشتہ تمہارے بیٹے اسد محمد سے طے کرتا ہوں۔“ حیات محمد نے اٹھ کر اپنے دوست کو گلے لگا لیا۔

تھکے مسافر کی منزل

آصف عمران/لاہور

بستی کے کونے کے ایک مکان میں ایک شخص رفتہ رفتہ اپنی موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جب تھکا تھکا سا آدمی سر جھکا کر بیٹھ طلب کرتا ہے اُس کی آنکھیں دروازے کی چوکھٹ پر جمی ہیں۔ اور کسی کے آنے کی اُمید اُس کی آنکھوں میں ساکت ہو چکی ہے اور مَیں عرصے سے سوچ رہا ہُوں کہ اَب مجھے چلنا چاہئے۔ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔ اور دُوسرے کمرے میں میری بیوی اور بیٹا مسلسل میری نگرانی کر رہے ہیں۔ یہ سب نہیں چاہتے کہ مَیں اکیلا ہی اُس سے مُلاقات کے لئے چلا جاؤں۔ مَیں دروازے کی طرف قدم بڑھاتا ہُوں تو وہ دونوں بھی میرے ساتھ آ کھڑے ہوتے ہیں۔ آخر فیصلہ ہُوا کہ عورت گھر میں رہے گی۔ ہم بہت جلد اُس سے مُلاقات کر کے واپس آ جائیں گے۔ گھر کے باہر ایک تباہ حال سڑک کے کنارے ایک دلدل ہے جس پر موت کے بھیڑیے کے پنجوں کے نشان ہیں۔ اور جہاں پر پنجوں کے نشانات گم ہو جاتے ہیں وہاں سے جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ جنگل میں آ بیٹھی پیڑوں کی قطار میں اندھیرا اچانک گہرا ہو جاتا ہے۔ سڑک پر بچھی خاموشی نے فضا میں منجمد آوازوں کی کشیدہ کاری۔۔ اضطرات اور تاریکی کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے۔ ہم سڑک پر آئے تو خاموشی ہمارے ساتھ چل پڑی۔

جنگل کی طرف جانے کے راستے بہت ناہموار ہیں اور جنگل میں بھید بھی بہت پائے جاتے ہیں۔ بے پرواحُسن کی رُونمائی، اَنہونی کا دھڑکا اور کسی انجانے موڑ پر خطرے سے آنکھیں چار ہونے کا اندیشہ۔ جنگل کی اپنی دُنیا ہوتی ہے۔ اُس کی خوبصورتی ہر وقت مجھے اپنی طرف مائل کرتی رہتی ہے۔ گذشتہ رات کی تیز برستی برکھا بارش نے راستے کو اور دُشوار گزار بنا دیا۔ لیکن آج ہمیں ہر حال میں اُس تک پہنچنا ہے۔ کیونکہ یہ آسمانوں کی تختی پر لکھا گیا ہے۔ میدان سے گزرتے ہُوئے مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ رُوئے زمین پر تمام میدان ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مجھے اِس بات سے کوئی غرض نہیں کہ یہ کونسا علاقہ یا کونسا ملک ہے کیونکہ ہم تو اپنے ہی انڈیا میں رہتے ہیں۔ میرا گزرا ہُوا وقت اُس بُوڑھے کی آغوش میں آرام کی نیند سو رہا ہے۔ اور آنے والے وقت کے بارے میں مَیں کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ کیونکہ بیٹے کے اِرادے اور خواہشات کے مُنہ زور گھوڑے میرے قابو میں نہیں۔ مگر آنے والا وقت اُسکی مٹھی میں بند ہے۔

ہم کب تک اُس کے پاس پہنچ جائیں گے۔۔۔ لمبے سفر کی تھکاوٹ لڑکے کی آنکھوں سے جھانکنے لگی۔ گزرے زمانے کا بوجھ بُوڑھے شخص کے کندھوں پر پہاڑ بن کر بیٹھ گیا۔ اُس کا سانس اُکھڑ رہا ہے اور وہ خاموشی سے اپنے وجُود کو منزل کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ مگر منزل ہے کہاں۔۔۔ بُوڑھے کی آواز رینگتی ہُوئی میرے کانوں کی طرف چل پڑی۔ میرے آگے اور پیچھے گہرا اندھیرا ہے۔ پیڑوں کے نیچے چلتا ہُوا راستہ گم ہوتا جا رہا ہے۔ اِن کی باتیں اور فکر مندی مجھے پریشان کر رہی ہے۔ مگر مَیں سیاہ دلدلوں میں اُگے صدیوں پُرانے جنگل کی خاموشیوں میں اُبھرنے والی ایک پُر اسرار آواز کا دامن تھامے آگے بڑھتا جا رہا ہُوں۔ اُس جنگل میں کالے ناگوں کے ڈیرے ہیں۔۔۔ چیرتوں کے بسیرے ہیں۔۔۔ اور ہم ایک اَن دیکھی آنکھ۔۔۔ یعنی لامحدود بصارت کے حصار میں ہیں۔ جو ہمیں زمانے کی لکیر کے جسم کو روندتے ہُوئے مسافت کی منزلیں عبور کرنے کی قوت عطا کرتی ہے۔

ہم بہت جلد اُس تک پہنچ جائیں گے۔ ہمیں صرف سیدھے رستے پر چلتے رہنا ہے۔ مَیں نے اُن کو اُمید اور تسلی کے خواب کی جھلک دکھائی۔ ناہموار راستے پر چلتے ہُوئے مَیں نے آنکھیں بند کیں تو تیسری آنکھ نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ میں لکڑی کی دیواروں والا ایک مکان ہے جس کی کھڑکیوں سے روشنی کی کرنیں باہر جھانک رہی ہیں۔ میرے دل کی گہرائی سے خُوشی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ مَیں نے آنکھیں کھولیں تو ہم اُس کے مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ اُن دونوں نے بھی سُکھ کا سانس لیا۔

مَیں آگے بڑھا اور دروازے پر دستک کے لئے ابھی ہاتھ اُٹھانے ہی والا تھا کہ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ مَیں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے روشنی کی سرد لہر میرے وجُود میں سرایت کر گئی۔ دروازہ کھولنے والے شخص نے گردن سے پاؤں تک سفید رنگ کو چوغہ پہن رکھا تھا۔

اندر چلے آؤ۔۔ تُم نے آنے میں خاصی دیر کر دی ہے۔ ہوا کی سرسراہٹ میں اُس کی آواز گہری غار کے دوسرے کنارے سے آتی محسوس ہُوئی جس نے ہماری سماعت کو اپنا قیدی بنا لیا۔

ہم تو بہت پہلے آنا چاہتے تھے مگر۔۔۔وقت اور حالات نے۔۔۔میں نے وضاحت کی کتاب کھولنی چاہی مگر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے میرے لبوں پر چُپ کی مُہر لگا دی۔اُس کی نظروں کے حصار میں ہم اُسکے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اُسکے کمرے میں پہنچ گئے۔کمرے کے ایک کونے میں ایک میز اور تین کرسیوں کے علاوہ بہت بڑا صندوق پڑا تھا۔

ایک حادثہ وقت کے اندھے جبڑوں سے پھسل پڑا۔ایک سانحہ تاریخ کے خوفناک عفریت کو جنم دے چکا ہے۔

دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کے منظر نے ہماری آنکھیں پتھرا دی ہیں۔

خوف اور خاموشی کی سرد ہوا نے ہمارے پیروں میں زنجیریں ڈال دیں۔اور چہروں پر حیرت خود بخود سراسیمگی کے رنگ میں ڈھلنے لگی۔کیونکہ دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر میں اُسے سُولی پر چڑھایا گیا ہے۔اُس کے سر پر کانٹوں کا تاج ہے مگر ہاتھوں اور پیروں میں لوہے کے کیل ٹھونک کر اُس کے جسم کو سُولی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔اُس کی پسلی میں سوراخ ہے جس سے لہو اب تک بہہ رہا ہے۔جب خُون بہتا ہے تو سب کو اُس کا رنگ نظر آتا ہے۔اُس کے بہتے لہو کو دیکھ کر بُوڑھے باپ پر لرزا طاری ہو گیا۔لڑکے نے اپنی مُٹھیاں بھینچ لیں مگر خاموش رہا۔وہ کبھی اُس تصویر کو اور کبھی اُس اجنبی کو دیکھ رہا ہے کہ جس کی پسلی سے لہو بہہ رہا ہے اور سُولی پر گردن جھکی ہوئی ہے مگر وہ ہمارے سامنے کھڑا ہے۔۔۔یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔لڑکے کے دماغ میں اُلجھن کی تیز ہواؤں کا طوفان برپا ہو گیا۔

میں تصویر کے منظر کو اپنی آنکھوں میں اُتار کر دل کے نہاں خانے میں محفوظ کر لیتا ہوں کیونکہ جانتا ہوں کہ وہ اب بھی ہر دل میں سُولی پر لٹکا ہُوا ہے۔

اچانک خاموشی کا غبارہ آواز کی تیز دھار سے پھٹ گیا اور اجنبی کی آواز نے ہمارے دھیان کے کاروان کو اپنی طرف موڑ لیا۔

تُمہارے لباس اور چہرے کی تھکن سے اندازہ ہوتا ہے کہ تُمہارا تعلق ماضی کی کسی گُزری ہوئی صدی کے زمانے کی بستی سے ہے۔اور تُم وقت کی لمبی مُسافت کی لہروں پر چلتے ہُوئے یہاں پہنچے ہو۔۔۔

ہاں۔۔۔ہم صدیوں سے مسلسل سفر میں ہیں۔ ابتدا ہی سے فاصلے وقت کے بیکراں دائروں میں سمٹ رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ہم نسل در نسل ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہے ہیں۔اسی لئے تھکاوٹ اور تجسس کی فصل ہمارے چہروں پر اُگ آئی ہے۔اور بھوک کی زنجیر نے ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے۔

تُم آرام سے بیٹھو۔۔۔میں تُمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔۔۔وہ اُٹھا اور کمرے کی دیوار میں سے گُزر کر دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ہم حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔تب ہماری آنکھوں میں کئی سوالوں کے خیمے تن گئے۔وہ ہمیں کسی اساطیری داستان کا کردار معلوم ہُوا۔ہمارے میزبان کے چہرے کی رنگت ہلکی زرد اور نقوش تیکھے ہیں۔مگر جو چیز اُس کے چہرے کو ناقابلِ فراموش بنا رہی ہے وہ اُسکی آنکھیں ہیں جن میں غیر معمولی چمک کے چراغ جلتے ہیں۔وہاں پُر اسرار خوابوں کی لہریں کشف کی روشنی سے نکل نکل کر الہام کے آسمانوں کو چھو رہی ہیں جن میں صدیوں سے اُبھرنے اور ڈوبنے والے واقعات اپنے اپنے رنگ میں رقص کناں ہیں جو ہمیں اپنے اندر اُترنے کی دعوت دیتے ہیں۔

وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں طرح طرح کے کھانے اور مختلف قسم کے پھل تھے۔اُس نے ان کو میز پر رکھا تو ہماری بھوک کے بھی ہاتھ کھانے کی طرف بڑھنے لگے۔میں نے انگور کا ایک چھوٹا سا گُچھا اُٹھایا اور دانہ دانہ کر کے مُنہ کے راستے پیٹ کے کنوئیں میں اُتارنے لگا۔

ہماری اچانک آمد نے تُمہیں حیران تو نہیں کیا۔۔۔میں نے اُس کی نظروں کے تیروں سے بچنے کے لئے آواز کی ڈھال کو آگے بڑھا دیا۔

نہیں۔۔۔اُس نے جواب دیا۔بلکہ میں تو بڑی دیر سے تُمہارا منتظر تھا کہ ہماری ملاقات ہو اور میں تم لوگوں سے اس جہان کے وقت کے گرد میں چھپے ہوئے واقعات کو جان سکوں،ماضی کی صدیوں پرانی داستان اس بوڑھے سے سُن سکوں اور میں اپنا علم اور آفاقی واقعات اور الہام کی سب باتیں اس لڑکے کے ذہن کے نہاں خانوں میں سجا دوں۔کیونکہ ہمارا آج تو رفتہ رفتہ حیاتِ ابدی کے وجود سے سرک رہا ہے۔

تُم یہاں کب سے ہو۔۔۔کیا اور لوگ بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔۔۔میں نے نئے سوال کو ہوا میں اُچھالا۔

ہاں۔۔۔وقفوں وقفوں سے یہاں کوئی نہ کوئی آ ہی جاتا ہے۔جب کچھ بھی نہیں تھا تو میں یہاں موجود تھا۔اور جب کچھ نہیں رہے گا تو میں پھر بھی یہاں موجود رہوں گا۔ابتدا اور انتہا کے درمیان جو بھی یہاں آتا ہے زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا۔جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ کسی ایک زمانے یا گروہ کے نہیں ہوتے۔۔۔جب دُنیا میں ایک ہی گروہ تھا تو اُس وقت ایک ہی زبان تھی۔پھر ایک سے زیادہ زبانوں کے باعث گروہ بھی تقسیم ہو گیا۔پہلا گروہ مشرق کی طرف سفر کرتے

کرتے کرتے ایک میدان میں پہنچا جہاں آگے دلدل تھی۔ تو وہ سب یہاں پر ہی بس گئے اور اپنی بستی آباد کر لی۔ پھر اُنہوں نے ارادہ کیا کہ ہم ایک اُونچا بُرج بنائیں جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے اور ہماری رسائی زندگی کے درخت تک ہو جائے۔ مگر وہ جو بادلوں کے تخت پر بیٹھا ہے اُن کے ارادوں پر مُسکرا دیا۔ یہ سوچ اُس کی منشا کے مطابق نہیں تھی کہ وہ لوگ زندگی کے بھید سے واقف ہو جائیں۔ تب اُس نے اُن کے درمیان دلیل اور ایجاد کی ایسی ہوا چلا دی کہ اُن کی زبان میں اِختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک زبان کئی زبانوں میں اور گروہ کئی گروہوں میں اور وقت کئی زمانوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور یہ گروہ زمین پر پھیلتے چلے گئے۔

اُس کا کلام مسلسل اپنی تیز دھار سے ہماری ساعتوں کو کاٹ رہا ہے۔ اجنبی ہماری طرف غور سے دیکھتا ہُوا پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر مایوس ہو کر کہا کہ تُم اپنا تعارف تو کراؤ۔۔۔

مَیں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بولنا شروع کیا۔۔ مَیں وقت کی دہلیز پر بیٹھا ہُوا وہ لمحہ ہُوں جو آنے والے وقتوں کو ماضی کے لبادے میں لپیٹ کر اِس بوڑھے کی طرف دھکیل دیتا ہُوں۔ میرے سامنے کائنات کی بیکراں وسعتیں ہیں۔ مَیں سوچ کے تیشے سے کائنات کے ازلی دائروں اور قوسوں اور گولائیوں کی شکل بدل کر زاویوں اور کونوں اور مثلثوں کو نئے نام سے نئی شناخت عطا کرتا ہُوں۔ میری آنکھوں میں اِنسانی ارتقاء کی مسلسل کہانی ہے۔ مَیں نے اجنبی کی طرف دیکھا تو وہ پھر بولنے لگا۔

عرصہ ہُوا مَیں نے قُدرت کی آفاقی داستانوں کی چند کتابیں پڑھی ہیں جو پانی کی طرح سوچ اور فکر کے دریا میں ڈوب گئی ہیں۔ وہ گہری سوچ میں گُم ہُوا تو مَیں فوراً بول اُٹھا۔ خاموشی ہمارے درمیان آ کھڑی ہُوئی۔

تُم اپنا نام تو بتاؤ۔۔ مَیں نے فوراً آواز کا تیشہ ہوا میں لہرایا۔

مگر مَیں تُمہیں اپنا نام نہیں بتا سکتا۔۔ کیونکہ میرا کوئی نام نہیں ہے۔ مَیں ایسی صدا ہُوں جو ہواؤں کے دوش پر تیرتی ہُوئی ازل سے ابد کی طرف مسلسل سفر میں ہے۔ مَیں ہر زمانے میں شکلیں بدل بدل کر نئے نئے وجود پہن کر یہاں آتا رہا ہُوں۔ مجھے فقط اجنبی کہہ کر بلایا جاتا ہے۔۔۔

تو پھر تُمہارے باپ کا کیا نام ہے۔۔ مَیں نے تجسس سے پُوچھا۔

اُس کا بھی کوئی نام نہیں ہے۔۔ جب اُس سے بھی پوچھا گیا تو اُس نے کہا تھا "مَیں جو ہُوں سو مَیں ہُوں"۔ یہی اُس کی پہچان ہے۔

اُس کی بات میری سمجھ کی حدود کے باہر سے گُزر گئی تو مَیں نے دیوار کی بغل میں نصب الماری کی طرف دیکھا اور اُسے کھول کر اُس میں پڑی ہُوئی کتابوں میں سے ایک ضخیم کتاب اُٹھا کر اُسے کھولا تو دیکھا کہ ہاتھ سے لکھی ہُوئی تحریر صاف مگر ناقابلِ فہم ہے۔ بڑے بڑے لفظوں نے تماثیل کے خوشنما پیراہن زیبِ تن کئے ہُوئے ہیں۔ مَیں کوشش کے باوجود اُس تحریر کو نہ سمجھ سکا۔

کسی مُرشد کی مدد کے بغیر اِسے نہیں سمجھا جا سکتا۔ تُم اِدھر دیکھو۔۔ مَیں تُمہیں ایک ایسی چیز دکھاتا ہُوں جو شاید تُم نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔۔۔

اجنبی نے مجھے پریشان دیکھ کر میری حیرت کے پرندے کو چہرے کی دیوار سے اُڑانے کے لئے آواز کا پتھر ہوا میں اُچھالا تو خاموشی پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

اجنبی نے کونے میں پڑے صندوق سے پتھر کی دو لوحیں نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دیں۔ اور زوردار پھونک کے تیزے سے لوحوں پر جمی ہُوئی گرد کی تہہ کو جڑ سے اُکھاڑنے کی کوشش کی۔ مٹی کے زخمی ذرے پھڑپھڑائے اور پھر تڑپتے ہُوئے اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ مَیں نے دھیان کی آنکھیں لوحوں پر کھدے ہُوئے لفظوں کی قطاروں پر گاڑ دیں۔ جو صدیوں سے ہاتھ باندھے بیٹھے ہُوئے تھے۔ مَیں بہت سی زبانوں سے واقف ہُوں مگر اِس زبان کو سمجھنے میں ناکام رہا۔ یہ زبانِ واحدہ میں لکھے گئے وہ احکام ہیں جو ہماری رُوح کی ہدایت کے لئے ہمیں عطا کئے گئے ہیں۔ مَیں اجنبی کی آواز کے طلسم میں مقید بڑے غور سے لوح پر تحریر لفظوں کو پہچاننے کی کوشش کرنے میں لگا رہا۔ کہ اچانک لڑکے کے مُنہ سے بے صبری کا شعلہ بلند ہُوا۔

یہ لوحیں تُمہارے پاس کیسے پہنچیں؟ یہ تو عہد کے صندوق میں بند تھیں۔ وہ عہد کا صندوق کہاں ہے؟ لڑکے کی لرزتی ہُوئی آواز زخمی ہرنی کی مانند ہوا میں ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ بُوڑھے مرد نے اپنا ہاتھ لڑکے کے کندھے پر رکھ دیا اور تسلی دینے لگا۔ بیٹا صبر۔۔ صبر کرو۔۔ وقت اپنے فیصلے خود کرتا ہے۔ اگلے زمانے میں کشف کی باتیں اور کتابیں حصہ بہ حصہ اور طرح بہ طرح لوگوں پر اُترتی رہی ہیں۔ یہ ایک عہد کے لئے ہی نہیں بلکہ گُزرے ہُوئے کل اور آج اور آنے والے کل کے لئے یکساں طور پر مؤثر اور دو دھاری تلوار کی مانند ہیں۔ مَیں اپنی صدیوں پرانی عمر میں صرف چار کتابیں پڑھ سکا ہُوں اور اہم بات اُنہیں صرف پڑھنا ہی نہیں بلکہ دوبارہ پڑھنا اور بار بار پڑھنا اور اُنہیں اوڑھنا اور بچھونا بنا لینا ہے۔۔۔ اب ایسی کتابیں اُترنا بند ہو چکی ہیں۔ آخری بار ایک جاندار اور سُریلی صدا ریگستانوں کی ایک غار کے مُنہ سے خاموشی کے جالوں کو چیرتی ہُوئی باہر نکلی اور ہوا کے

دوش پر سوار تمام جہان کی فضاؤں میں پھیل گئی۔ اور ہر لمحہ کائنات کے گوشے گوشے میں گونجتی رہتی ہے اور لوگ اُس کی بازگشت کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔

اجنبی نے اُن لوحوں کو دوبارہ صندوق میں رکھ دیا۔ اور خلا میں گھورتے ہوئے سرگوشی کرنے لگا۔ ہدایت کی رُوح اب ہواؤں کے طوماروں میں لپٹی ہوئی ہمارے ذہنوں کے دریچوں میں اُترتی ہے۔ تمہیں! ابھی حالات میں زندگی کی تسبیح کے دانوں پر دن رات کی گنتی کا گوشوارہ لکھنا ہے۔۔ چند لمحوں کے لئے کمرے میں خاموشی کی چادر پھیل گئی۔

لڑکے نے پھر اپنا ہاتھ جوش سے لہرایا اور اپنے ذہن کی کتاب کو کھول کر پڑھنے لگا۔۔۔ جو زندگی میں گزار رہا ہوں اس میں تو بہت ضروری ہے کہ صبح سے شام تک رُونما ہونے والے تمام واقعات سے باخبر رہوں۔ میرے پاس انٹرنیٹ ہو۔۔ سمارٹ فون ہو۔۔ اور دُنیا کے تمام واقعات اور تاریخ کے سب صفحے میرے ایک اشارے پر میرے سامنے آ کھڑے ہوں۔

اَے نوجوان! دُنیا کی تمام خبریں چند گھنٹوں تک گفتگو کے لئے پڑھی جاتی ہیں۔ کیونکہ کچھ دیر بعد دوسری باتیں اور واقعات منظرِ عام پر آ جاتے ہیں جو پہلی تمام باتوں کو ماضی کے پنجرے میں قید کر دیتی ہیں۔ باتوں کا یہ سلسلہ وقت کی رسی پر مسلسل سفر کرتا رہتا ہے اور ان سب باتوں کو جھیلتے ہوئے ہم بالغ ہو جاتے ہیں۔ بالغ آدمی اپنا اور اپنی تنہائی کا سامنا کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔ تو اُس وقت وہ اکیلا بھی رہ سکتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا آپ مالک ہوتا ہے اور اپنی موت کا بھی مالک ہوتا ہے۔ موت کا ذائقہ بھی ہر شخص کی ذاتی معرفت ہے۔ اس میں کوئی بھی شریک نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ کسی کو بتا سکتا ہے۔

اجنبی کی سرگوشیاں گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ تُمہارے لئے یہ جاننا سب سے ضروری ہے کہ جو لوگ زندگی میں ہی اپنا ہاتھ موت کے سپرد کر دیتے ہیں اُن کی سانسوں کی چادر جلد ہی اُن کے وجود سے اُتر جاتی ہے اور وہ آسانی سے ایک زمانے کا دریا عبور کر کے دوسرے دریا میں کود جاتے ہیں۔

مجھے خوفزدہ نہ کرو۔۔ مَیں اپنی زندگی آپ جینا چاہتا ہوں۔۔ لڑکا اُٹھ کر اُس دیوار کے سامنے جا کھڑا ہوا جہاں تصویر میں اجنبی مصلوب ہوا ہے اور اُس کا لہو قطرہ قطرہ بہہ کر زمین پر پھیل رہا ہے۔

مَیں نے بوڑھے ساتھی کی طرف دیکھا وہ سرد نظروں سے مسلسل اجنبی کو گھور رہا تھا۔ ماحول نے خوفناک حد تک خاموشی کی چادر اوڑھ لی۔۔

ہماری آنکھیں پتھرا رہی ہیں اور ذہن گہری نیند میں اُتر رہے ہیں۔ مجھے لگا جیسے ہم پتھر کے بُت بنتے جا رہے ہیں۔ صدیوں کے مسلسل سفر کے بعد ہم یہاں پہنچے ہیں۔ سُرمئی بادلوں کی دھند اور تیز ہواؤں کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی بارشوں کے سب منظر میری آنکھوں میں تیر رہے ہیں۔ جہاں وقفہ وقفہ سے اجنبی کی جھلک اپنی طرف کھینچتی ہے۔

مَیں تو کب سے تُمہارے دل کے دروازے پر دستک دے رہا ہوں کیونکہ مجھے اپنی رُوح میں جھانکنا اچھا لگتا ہے۔ رُوح میں جھانکنا ایسے ہی ہے جیسے کسی گہرے کنویں میں جھانک رہا ہوں جس کی تہہ میں ایک نامعلوم طوفان برپا ہے۔ مَیں زبردست گھن گرج کے ساتھ اس دائرے کی قید سے رہائی کے لئے کوشاں ہوں۔۔ اجنبی کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔

اجنبی نے ایک نظر لڑکے کو دیکھا اور پھر کھڑکی کھول دی اور باہر دیکھنے لگا۔ چاند کی روشنی اُونچے اُونچے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر ہوا کے زینے سے اُترتی ہوئی کمرے میں جھانکنے لگی۔ ہم سب کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگے۔ اجنبی کی خاموش نگاہیں دُور خلاؤں میں اُبھرتی ہوئی سرسراہٹ کو محسوس کر رہی تھیں۔ اور اُس کے جسم سے نکلنے والی حرارت کی لہریں ہمیں نئی قوت کا لباس پہنا رہی ہیں۔ میرے اندر حیرت کی کوکھ سے نئے نئے جذبے جنم لینے لگے ہیں۔ نئے نئے خیال آسمان کی وسعتوں کو آواز دے رہے ہیں۔ اُس کی آواز میرے وجود کو جھنجھوڑ کر گہرے سناٹے میں گم ہو رہی ہے اور مَیں بھی اُسے آواز دیتا ہوں مگر میری آواز واپس لوٹ کر کانوں میں سرگوشی بن کر لہراتی ہے کہ یہاں کوئی نہیں۔۔ کوئی نہیں۔۔۔

''جو مَیں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے''۔۔ آنکھیں رُوح کی طاقت کا اظہار کرتی ہیں۔ اسی لئے وہ دوسروں کو مغلوب کر لیتی ہیں۔۔ جو بادلوں کے تخت پہ بیٹھا ہے مَیں اُس کی آنکھوں سے مغلوب ہوں اور تم میری آنکھوں سے مغلوب ہو۔۔ اجنبی بولا۔ یہ مجھے آسمان کی تختی پر لکھا ہوا نظر آ رہا ہے۔

تُمہاری اس بات میں کوئی بہت بڑا بھید دفن ہے۔۔ جو آج تک مجھ پر آشکار نہیں ہو سکا۔ اور مَیں اسی لئے تُمہارے پاس اپنے گزرے کل اور آنے والے کل کے ساتھ آیا ہوں تا کہ جان سکوں کہ۔۔۔

جو کچھ تُمہارے لئے جاننا ضروری ہے تم اُسے پہلے سے جانتے ہو۔۔ اجنبی کی گہری سرگوشی کے لفظوں نے میری سماعت کے پیالے کو لبالب بھر دیا۔ مَیں خاموشی سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

رُوح کے اسرار سمجھنے کے لئے اور من کے اندر جھانکنے کے لئے تیسری آنکھ یعنی وجدان کو وسیلہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے گہرے بھید کھولنے کے لئے اپنے

دل کی کتاب کے صفحے اُلٹنے لگا۔ ہمارا یہی وجدان ظاہر اور باطن کے درمیان رابطے کا ذریعہ بھی ہے اور اشیاء کی حقیقت تک رسائی کا ذریعہ بھی۔

اُسکی نظریں خلاؤں میں کسی کے قدموں کی چاپ محسوس کر رہی ہیں۔ تجسس اور خوشی کے رنگوں کی خوشبو اُس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی ہے۔

مجھے کیا معلوم ہے جو اُسے بھی معلوم ہے۔۔ مَیں نے اپنے اندر جھانکا تو مجھے لگا کہ مَیں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ مَیں کب جانتا تھا کہ ہابیل کو قتل کر کے قابیل کو پچھتاوا آن گھیرے گا۔ مَیں کب جانتا تھا کہ چالیس دن اور چالیس رات تک مسلسل تیز بارش ہوگی تو پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے پچاس ہاتھ اُوپر تک جمع ہو جائے گا اور سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ سوائے اُن جانداروں کے جو نوحؑ کی کشتی میں سوار تھے۔ تب اس بربادی پر وہ خود بھی مغموم ہوگا اور پھر آسمان پر قوسِ قزح کے رنگوں کو لہرا کر نیا عہد باندھے گا۔ مَیں کب جانتا تھا کہ تین دن اور رات مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے بعد اُسے لوٹ کر نینوا جانا ہوگا۔ مَیں کب جانتا تھا کہ مصلوب ہونے کے بعد تین دن تک قبر میں دفن رہنے کے بعد اُسے آسمانوں پر بُلا لیا جائے گا۔ مَیں کب جانتا تھا کہ ریگستانوں کے غار کی تاریکیوں کو چیرتی ہوئے سچائی کی روشنی ہوا کے رتھوں پر سوار کائنات کی بیکراں وسعتوں میں پھیل جائے گی۔ اور دُنیا کا کوئی ایسا گوشہ نہ ہوگا جہاں اُسکی آواز دن رات کے ہر لمحے گونجتی نہ رہے گی۔۔ مَیں اُس کی خوشبو میں جذب ہوتا جا رہا ہوں کہ اچانک ایسے لگا جیسے فضا میں ایک تارا ٹوٹا ہے اور اُس کی روشنی کی لکیر کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوگئی۔

جلدی سے آؤ۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ مَیں تُمہیں کچھ چیزیں دکھاؤں۔۔ اُس نے اشارہ کیا اور ہم اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ہم ساتھ والے کمرے میں گئے۔ وہاں دیواروں پر بہت سے لپٹے ہُوئے طومار تصویروں کی طرح لٹک رہے تھے جن میں مختلف زمانوں میں آنے والی بشارتوں کے نقش بنے ہُوئے ہیں۔ تمام تحریروں میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ یہ میرے سفر کی کہانی ہے۔ اجنبی نے طوماروں کی طرف اِشارہ کر کے کہا۔

مَیں نے ان تحریروں کو غور سے دیکھا جن پر وقت اور زمانوں کی دھول پڑی ہُوئی تھی۔ مَیں نے ہر طومار کو کھول کر پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔۔ اگر تُمہیں کوئی تحریر پسند آئے تو اُسے میری طرف سے تحفہ سمجھو۔۔ مَیں تُمہیں اس کا سیاق وسباق اور مفہوم کے بھید سمجھاؤں گا۔ جس سے اِن طوماروں کے رنگ نمایاں ہو جائیں گے اور آنے والا زمانہ تُمہیں میری یاد دلائے گا۔۔ یہ تحریریں اُن واقعات اور احکام اور اعمال کا احاطہ کرتی ہیں جو تُمہاری ماضی کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہُوئی۔۔ وہ آ گئے ہیں۔ مجھے لے جانے کے لئے۔۔ اجنبی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ مَیں نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک ہجوم اُس دروازے پر اکٹھا ہے جنھوں نے سفید بادلوں کے جامے پہن رکھے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ آج رات ضرور آئیں گے۔۔ اجنبی نے وضاحت کرتے ہُوئے ہمیں بتایا۔

یہ کون لوگ ہیں۔۔ مَیں نے سوال کے کشکول کو آگے بڑھایا۔

یہ وہ ہیں جنھوں نے سچائی اور روشنی کا پرچم ہر حال میں تھامے رکھا اور اِنصاف اور عدالت کے منتظر ہیں۔ اجنبی نے ایک ایک چیز کو نظر بھر کر دیکھا اور پھر سب طومار سمیٹ کر اپنے صندوق میں رکھ لئے اور کہا چلو چلیں۔۔ بُلاوا آ گیا ہے۔۔ ہم اُسکے پیچھے پیچھے گھر سے باہر نکل آئے تو وہ ہجوم ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ جنگل میں تھوڑی دُور چلنے کے بعد ہم ایک میدان میں پہنچ گئے جس کے وسط میں ایک بلند مینار ہے جس کا گنبد آسمان کو چھو رہا ہے۔ اُس گنبد کے چاروں طرف سے روشنی کی کرنیں باہر جھانک رہی ہیں۔

یہ زندگی کا مینار ہے۔۔ کسی نے کہا۔ اس کے اندر جسم کی قبر کی مٹی اور رُوح ایک دوسرے سے ہاتھ چھڑوا لیتی ہیں۔ یہی ہماری منزل ہے۔۔

سرگوشیاں آہستہ آہستہ سر اُٹھانے لگیں۔۔ تب اجنبی نے مینار کے دربان سے بات کی۔۔ کتنے لوگ ہیں۔۔ دربان نے ہجوم پر نظر ڈالی۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار۔۔ اجنبی نے جواب دیا۔ دربان نے تعداد کو نظر کے ترازو میں تولا اور مینار کا دروازہ کھول دیا۔ اور وہ سب باری باری اندر داخل ہو گئے۔ اجنبی نے سب سے آخر میں داخل ہونے سے پہلے گھوم کر میری طرف دیکھا اور الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا تو دروازہ بند ہو گیا۔ مَیں نے گنبد کی طرف دیکھا تو گنبد سے نکلتی ہُوئی روشنی میں وہ سب بھی بادلوں میں تیرتے ہُوئے نظر آئے۔

لگتا ہے کہ آج رات بستی میں بہت تیز بارش ہوگی۔۔ مَیں نے بستی کی طرف مُڑتے ہُوئے کہا۔

لڑکے نے تھکے تھکے ہاتھوں سے ان لوحوں کو کندھے پر رکھ لیا اور بوڑھے نے وہ طومار اپنی بغل میں دبا لئے۔۔۔

مَیں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا ہُوں جہاں میرے کمرے کے ایک کونے میں بے شمار کتابوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ اور اُن کے اُوپر وقت کی تختی پڑی ہے جس پر صدیوں میں مستقبل کا آدمی کرۂ ارض پر پھیلے ہُوئے رنگوں کی مدد سے نئی تصویر بنائے گا جس کی خوشبو چاروں طرف ہمیشہ پھیلتی رہے گی۔

میرے درد کو جو زباں ملے

نادیہ بشیر احمد/راول پنڈی

مسلسل روئے جا رہا تھا اور اس کی ماں تو جیسے وہاں موجود ہی نہ تھی۔ تانیہ کب سے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ خود بھاگ کے چلی جائے۔ شادی کے آٹھ سال بعد بھی اس کی گود ہری نہ ہوئی تھی اور اب تو جیسے اس کی برداشت ختم ہی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے دل میں پلنے والی اس خواہش کو کنٹرول کر ہی نہ پا رہی تھی اور آج پڑوس کے بچے کی رونے کی آواز نے تو جیسے اس کے سارے زخم ہرے کر دیے۔ سارے جذبات تازہ کر دیے۔ آج قاسم کی بھی زبردست شامت آنے والی تھی۔

قاسم تانیہ کو بچپن سے بہت چاہتا تھا اور بچپن کی محبت پروان چڑھی اور قاسم تانیہ کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ شادی کے بعد بھی قاسم کی محبت کچھ اس طرح سے بھر دی تھی کہ اسے اس کا غلط بھی غلط نہ لگتا تھا۔ تانیہ کی بداخلاقیاں اور بدتمیزیاں بھی گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اور اب تو گھر والوں نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ قاسم کو تانیہ کے سامنے کچھ نظر نہیں آتا۔ اسے کچھ کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں۔

قاسم نے تانیہ کی ہر خواہش پوری کی اور اس خواہش کو بھی پورا کرنے کے لیے اس نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ کوئی ڈاکٹر نہ چھوڑا کوئی طبیب، دم، درود، تعویذ کچھ بھی تو رہنے نہ دیا تھا۔ ویسے تو تانیہ خود مختار تھی۔ وہ خود بھی جو چاہتی کر لیتی جہاں چاہتی چلی جاتی۔ حالانکہ ان دونوں کی ہر رپورٹ ٹھیک آتی رہی لیکن شاید اللہ کو ہی منظور نہ تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا تانیہ کی بے صبری بھی بڑھتی جاتی تھی اور قاسم بالکل سمجھنے سے قاصر تھا کہ کیا کرے؟

جانے قاسم کو کیا سوجھی کہ اچانک تانیہ کو اس کی ماں کے گھر چھوڑ آیا اور ابھی کسی کو کچھ کہنے سننے کا موقع ملتا کوئی کچھ سوچتا، کچھ سمجھتا اگلے ہی اسے طلاق کے کاغذ بھجوا دیے۔ تانیہ تو جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔ اسے تو سمجھ ہی نہ آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے؟ اسے کس جرم کی سزا دے دی گئی ہے؟ کیا اولاد کی خواہش رکھنا بھی کوئی جرم ہے؟ وہ تو پتھرا سی گئی تھی۔ پھر جو رونے لگی تو آنسو ہر پل پلکوں پہ دھرے رہتے۔ چند ہی دنوں میں اس کا سارا حسن کملا گیا۔ دوسرے طرف سارا خاندان بھی صدمے میں تھا۔ عجب عجب باتیں ہو رہی تھی۔ کچھ کو تو شک تھا کہ قاسم سٹھیا گیا ہے کہ ایسی مثالی محبت کرنے والا انسان ایسا کیسے کر سکتا ہے؟

نہ وہ کسی سے بات کرتا تھا نہ کسی کی بات کا جواب دیتا تھا نہ کوئی دلیل نہ حجت۔ ماں نے جنہوں نے سو جتن کیے کسی کی سمجھ میں نہ آیا اس نے تو بس ایک چپ سادھ لی تھی۔ خیر اب کچھ کہنے سننے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ دونوں طرف بول بول کے سارا خاندان اب چپ کر گیا تھا۔

تانیہ کے گھر والوں نے پہلے ہی بڑی مشکل سے تانیہ کو بیاہا تھا۔ اب وہ شادی شدہ کا بھی لیبل لگوا آئی تھی۔ دولت تو ان کے پاس تھی نہیں کہ ایسے عیبوں پہ پردہ ڈل جاتا۔ اوپر سے اگر کہیں رشتے کی بات ہوتی بھی تو لوگ سو سو باتیں بناتے کہ جانے بچہ نہ ہوتا تھا تو نکال دی گئی۔ بہت کوششیں کیں لیکن تانیہ کے تو نصیب ہی سو گئے تھے اور وقت پہ وقت گزرتا جا رہا تھا۔

اور ادھر قاسم کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے جو بات سارے جہان سے چھپائی تھی وہ خود سے تو نہ چھپا سکتا تھا۔ قاسم نے تانیہ کی شدید خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے محض اس لیے چھوڑ دیا کہ اس کی کہیں اور شادی ہو جائے اور اس کی یہ خواہش پوری ہو جائے۔ وہ تانیہ کو تڑپتا ہوا دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ جانے یہ کیسی محبت تھی؟ محبت ایسا بھی کرواتی ہے؟ سنتے ہیں کہ محبت قربانی کا نام ہے اور شاید قاسم بھی ایسا سوچتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ تانیہ کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس کے لیے اس کی خواہش کے لیے کچھ بھی کر گزرے گا لیکن وہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ اس سے بڑی بہت بڑی ایک طاقت موجود ہے جو انسان کے خدا بننے کی کوششوں کے تماشے روزِ ازل سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے لیے یہ تماشا بھی کوئی نیا نہ تھا اور قاسم کو خبر نہ تھی کہ آنے والا وقت اسے کیا دکھانے والا ہے۔

اسی اثنا میں گزر گیا۔ تانیہ کی حالت بے حد

خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اسے سمجھ نہ آتا تھا کہ غلطی ہوئی کہاں ہے؟ کیا اسے اولاد کی خواہش کے پیچھے یوں سرگرداں نہیں ہونا چاہیے تھا یا کہ اسے خدا کی رضا پہ راضی ہونا نہ آیا؟ بس سوچیں تھیں ان گنت سوچیں، ان مٹ یادیں۔

خاندان بھر سے یہ خبریں قاسم تک بھی پہنچتی رہتی تھیں۔ کوئی ثانیہ کی حالت زار پہ دکھی ہو کر قاسم کو برا بھلا کہتا تو کوئی کہتا کہ قاسم نے اولاد کے حصول کے لیے ثانیہ کو چھوڑا۔

قاسم نے بھی کوئی الگ ہی دماغ پایا تھا۔ جانے اس کے دماغ میں خلل ہی تھا کہ اسے محبت لے ڈوبی تھی۔ آخر وہ ایک دن اپنے انتہائی قریبی دوست کے آگے پھٹ ہی پڑا۔ اور اسے دل کا راز دے دیا ساری روداد سنا ڈالی۔ اب دونوں سر جوڑے اس مسئلے پر سوچنے لگے۔ شاداب نے ذرا جھجکتے ہوئے قاسم کو اک مشورہ دے ڈالا۔ جیسا کہ قاسم اپنے کیے پہ انتہائی نادم تھا تو قاسم نے اسے مشورہ دیا۔ حلالہ کا......

قاسم تو جیسے سن ہو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد اسے بھی یہ بات کافی معقول لگنے لگی۔ اب انھیں تلاش تھی ایک ایسے شخص کی کہ جو ثانیہ سے شادی کر کے کچھ وقت کے بعد اسے چھوڑ دے اور پھر ثانیہ واپس قاسم کی زندگی میں آ جائے۔

آخر انھیں طفیل کا خیال آیا۔ وہ ان دونوں کا مشترکہ دوست تھا۔ ویسے تو وہ ایک آزاد طبع انسان تھا۔ شادی کا وہ قائل نہ تھا مزے سے زندگی گزارتا اور ایسے جھنجھٹ کا قائل نہ تھا۔ دونوں نے سوچا یہ اس کام کے لیے بہترین ہے۔ طفیل سے بات ہوئی اور تھوڑی حیل وحجت کے بعد طفیل راضی ہو گیا۔

اب مسئلہ تھا ثانیہ سے بات کرنے کا، اُسے سمجھانے کا اور اس کام کے لیے ظاہر ہے قاسم سے بہتر تو کوئی نہیں تھا۔ پہلا مرحلہ تو ثانیہ سے ملنے کا تھا۔ بڑی کوششوں کے بعد قاسم ثانیہ سے فون پہ بات کر سکا لیکن ثانیہ اس سے ملنے پہ راضی نہ ہوئی۔ اب پھر سے سب مشکل میں پڑ گئے۔ کافی سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ ثانیہ سے بات نہ کی جائے۔ جب سب کچھ ہو جائے گا تو وہ تو مان ہی جائے گی۔ اس کی رائے اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ اسے ماننا ہی ہوگا۔

طفیل کے اپنے ماں باپ بہن بھائی تو تھے نہیں۔ کچھ رشتے داروں سے جو اس نے بات کی تو سب نے راضی خوشی نیکی کا کام جان کے ساتھ ہو کے ثانیہ کے گھر والوں سے بات کر لی۔ وہ تو جیسے پہلے ہی اس انتظار میں تھے کہ اس مصیبت سے چھٹکارا پایا جائے۔ چونکہ طفیل نے کوئی مطالبہ بھی نہ کیا تو وہ فوراً راضی ہو گئے اور حسب معمول ثانیہ کی رائے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ کوئی دھوم دھڑکا تو ہونا نہ تھا سو خاموشی سے ثانیہ رُخصت ہوئی اور طفیل کے گھر آ گئی۔ ثانیہ کو لگا کہ اب اس کی زندگی معمول پہ آ گئی ہے لیکن ابھی کچھ ہی دن بیتے تھے کہ قاسم نے طفیل سے مطالبہ شروع کر دیا۔ طفیل نے قاسم کو سمجھایا کہ ابھی وقت گزرنے دو ابھی یک دم ایسے سب کو بہت غصہ آئے گا اور بات بگڑ سکتی ہے۔ پھر تم نے رہنا بھی اسی خاندان میں ہے تو تھوڑا صبر کرو اور پھر ابھی ثانیہ سے بھی تو بات کرنا باقی تھا۔ دلوں کے حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ طفیل نے کبھی شادی کا سوچا نہ تھا لیکن ثانیہ سے شادی کے بعد اس کی زندگی بڑی منظم ہو گئی تھی۔ سب کچھ وقت اور جگہ پہ ملنے لگا تھا۔ طفیل کا دل نہ تھا کہ ثانیہ چلی جائے۔ اس لیے اس نے تھوڑا وقت آگے کرا دیا کہ شاید چند دن میں اس کا دل بھر جائے اور وہ اپنی پچھلی روٹین کی طرف لوٹ جانا چاہے۔ ابھی مہینہ بھر ہی گزرا تھا کہ قاسم نے پھر شور مچا دیا۔ ادھر ثانیہ بھی گھر کا ماحول کچھ بے چین سے محسوس کرتی تھی۔ قاسم کا آئے دن فون پہ فون آتا اور طفیل سے تلخ کلامی ہونے لگی۔ آخر کب چھپ سکتے تھے۔ اسی شور شرابے میں ایک دن قاسم گھر آ گیا اور دونوں میں خوب لڑائی ہوئی اور تب ثانیہ پہ ساری صورت حال واضح ہو گئی۔ وہ تو جیسے سن سی ہو گئی اور چکرا کے گر گئی۔ اپنی لڑائی بھول کے اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ وہاں ایک نیا شاک ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ثانیہ اُمید سے تھی۔ طفیل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ خوش ہو کہ پریشان۔ قاسم بے حد پریشان ہو گیا۔ اب تو بچہ ہو جانے تک طلاق بھی نہ ہو سکتی تھی اور ثانیہ اس کو خدا نے خوشی بھی دی تو کس وقت پہ جب وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے خوش ہونا ہے کہ اپنے ساتھ اس گھناؤنے مذاق پہ غصہ کرنا ہے۔ ان مردوں نے خود سے ہی سب کچھ طے کر لیا تھا اسے تو کوئی کٹھ پتلی سمجھ لیا گیا تھا۔ جانے وہ اپنی بات منوانے والی شوخ اور چنچل ثانیہ کہاں گم ہو گئی تھی۔ اس نے بھی تو خود کو زمانے کے حوالے کر دیا تھا۔ ثانیہ سوچنے لگی کہ اسے کیا کرنا ہے؟ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ بھی آج تک قاسم کو بھول نہ پائی تھی

لیکن طفیل کو وہ چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ دوسرے طرف طفیل عجب کشمکش میں مبتلا تھا کہ دوست سے وعدہ نبھائے کہ بیوی سے کیے گئے نکاح کا عہد۔ قاسم نے جو یہ صورت حال دیکھی تو شاداب کو بیچ میں ڈالا اور طفیل پہ دباؤ بڑھایا۔ اسے مردوں کے کیے گئے عہد یاد دلائے گئے۔ مرد کی زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے اور ایسی ہی بے شمار باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی باور کرایا گیا کہ تانیہ پہ صرف قاسم کا ہی حق ہے۔ طفیل نے اپنا عہد نبھانے کا وعدہ کیا اور تانیہ سے حتی الامکان دوری اختیار کی تاکہ اس کا دل تانیہ سے دور ہو جائے۔ قاسم کو تو پتا ہی نہ تھا کہ وہ تانیہ کو کسی اور مرد کے ساتھ دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اسے تو اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ وہ اس کا ایک جذباتی فیصلہ تھا جو تانیہ کی حد سے بڑھتی ہوئی خواہش کے آگے ہو گیا لیکن اصل حقیقت تو اب اس کے سامنے آئی تھی اور اس سب میں وہ اتنا خود غرض ہو گیا کہ اس نے نہ تو تانیہ کے لیے سوچا اور نہ ہی اس ننھی سی جان کے لیے۔

تانیہ اپنے بچے کو اس کے باپ سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اب طفیل کی طبیعت میں بدلاؤ آ گیا تھا۔ وہ تانیہ کی بالکل پروا نہ کرتا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جب تانیہ نے جانا ہی ہے تو اس سے دل نہ لگایا جائے اور وہ اپنی پرانی روش پر چل نکلا لیکن وہ اندر ہی اندر سلگتا ضرور رہتا تھا۔ تانیہ نے بہت بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن طفیل رات دیر سے آتا اور اس کی حالت بھی ایسی نہ ہوتی کہ اس سے کوئی بات کی جائے۔ قاسم نے گھر بھی آنا شروع کر دیا تھا۔ طفیل قاسم کو تو کچھ نہ کہہ سکتا تو تانیہ پہ بلاوجہ غصہ کرتا اور تانیہ ان دونوں کے بیچ مانو پس کے رہ گئی تھی۔ جو قاسم کو گھر آنے سے منع کرتی تو وہ وہاں کھڑا کر دیتا اور اس کا الزام طفیل کو دیتا اور پھر لڑائی ہوتی۔ طفیل الگ تانیہ پہ چیختا چلاتا۔ اسے خود سمجھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے؟ شاداب الگ ان سب حالات سے پریشان تھا۔ اسے تو اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ جس کام کو اتنا آسان سمجھ رہے تھے وہ اس طرح سے اُلٹ جائے گا۔ دن گزرتے گئے حالات کشیدہ ہوتے گئے۔

کوئی بھی کام جس کی بنیاد ہی غلط اُٹھائی گئی ہو اس کا انجام ٹھیک کیسے ہو سکتا ہے اور یہ بات کسی کو بھی تو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ جب گھر کی بنیاد ہی کھوکھلی ہو تو نقب لگانا آسان ہوتا ہے اور خدائی کا دعویٰ کرنے والے خود کو ہی کنٹرول نہ کر پا رہے تھے۔ کیا جانتے نہ تھے کہ ہر دور میں ہر فرعون نیست و نابود ہو گیا؟ نہیں، انسان کی ایک بہت بڑی کمزوری کہ وہ بھول جاتا ہے۔ اسے ڈبوتی بھی ہے اور بچاتی بھی ہے۔

آخر وہ دن آ گیا جب تانیہ کو ایک نئے امتحان سے گزرنا تھا۔ زندگی اور موت کا امتحان۔

اس سارے دوران تانیہ نے بہت اذیت کا وقت گزارا۔ طفیل اور قاسم دونوں اتنے خود غرض ہوئے تھے کہ کبھی سوچ نہ سکے کہ تانیہ بھی ایک انسان ہے اور اس کو اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ آج کا دن تھا ہی اضطراب کا دن۔ طفیل سوچ رہا تھا کہ اب بچہ ہو جانے کے بعد کیا ہو گا؟ کیا تانیہ اسے چھوڑ کر چلی جائے گی؟ کیا اس کا بچہ اس سے دور چلا جائے گا۔ قاسم بھی ہسپتال پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے بہت برداشت کر لیا ہے اب وہ یہاں سے تانیہ کو لے کر ہی جائے گا اور اگر طفیل سیدھی طرح نہ مانا تو وہ اس کا بھی بندوبست کر کے آیا تھا۔

تانیہ عجب اضطراب محسوس کر رہی تھی۔ ان نو ماہ میں اس نے ہر ہر دن اذیت کا گزارا تھا۔ جس خوشی کو پانے کے لیے وہ دن رات تڑپتی رہی اس خوشی کا جب وقت آیا تو وہ خوش کیوں نہیں؟ یا وہ خوش ہے تو اسے لگ کیوں نہیں رہا؟ کوئی دن وہ اپنے گھر میں ایک ہنستا کھلکھلاتا بچہ اپنے شوہر اور خود کو دیکھ نہ سکی۔ کوئی دن اسے نہیں لگا کہ وہ دن جس کا اسے انتظار ہے آنے والا ہے۔ وہ کیسے اپنے بچے کے ساتھ رہے گی۔ کھیلے گی بولے گی وہ کبھی سوچ ہی نہ سکی اور جس اذیت ناک وقت سے وہ گزر رہی وہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور آج جب اس کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے جا رہی تھی تو بے حد بے چین تھی۔ اس کا بی پی نارمل نہ ہو رہا تھا اور یہ مسئلہ ڈاکٹر کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ کیا جانیں کہ اس کے اندر کیا طوفان چل رہا تھا۔ ہر ممکن کوشش کے بعد بھی اس کا بی پی نارمل نہ ہو سکا اور وہ ننھی جان اس دنیا میں آنے کے لیے بے چین تھی۔ اس دردناک حقیقت کا سامنا کرنے کو تڑپ رہا تھا اور مجبوراً ڈاکٹر کو اس کنڈیشن میں ہی آپریشن کرنا پڑا۔ ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود تانیہ جانبر نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر نے باہر آ کر بتایا قاسم اور طفیل سمجھ ہی نہ سکے ان کی خود غرضیوں نے ایک عورت سے اس کی دنیا، اس کی زندگی چھین لی۔ طفیل اور قاسم کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تانیہ ایک خوبصورت بچے کو جنم دے کر اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔

آرام طلب

سعدیہ بتول/اسلام آباد

آپ کہیں جاب کرتی ہیں؟ ویٹنگ روم میں بیٹھی ایک پر اعتماد خاتون نے مسکراتے ہوئے روشنیہ کی جانب سوال اچھالا۔نہیں پڑھتی ہوں۔کیا پڑھتی ہیں؟ انٹرویو آگے بڑھا۔جی ایم فل کر رہی ہوں۔روشنیہ نے ساس سے نگاہیں چراتے ہوئے مجرمانہ انداز میں جواب دیا۔وہ جانتی تھی کہ اب اس کی شامت آنے والی ہے۔کچھ عرصے سے اس کیلئے اس کی تعلیم اور ڈگریاں باعث فخر ہونے کے بجائے ذلت کا سبب بن کر رہ گئی تھیں۔وہ اتنی شرمندگی سے اپنی تعلیم بتاتی جیسے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔اس سے اگلا سوال حسب توقع تھا جس کیلئے اس کا ذہن پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔کل ہی نوائے وقت میں جاب کی نئی ویکنسیاں آئی ہیں اپلائی کیا؟ ساتھ بیٹھی ایک اور محترمہ بھی گفتگو میں حصہ لینا ضروری سمجھتے ہوئے بولیں کہ بھئی میں تو کہتی ہوں کہ جاب ہو تو گورنمنٹ کی۔اس کی تو ٹور ہی الگ ہوتی ہے پہلی محترمہ ابھی تک سوالیہ نگاہیں روشنیہ کے چہرے پر مرتکز کیئے بیٹھی تھیں۔اس نے مرے مرے لہجے میں جواب دیا کہ "نہیں"(اور کہتی بھی کیا) آنٹی جھٹ بولیں اسے نوکری لے بھی تو چھوڑ دیتی ہے۔کیا کروں گھر کے کام.....وہ منمنائی۔ہنہ گھر کے کیا کام ہیں میں نے تو اسے دو دو نوکر رکھ کر دیئے ہوئے ہیں۔آنٹی نے باآواز بلند اعلان کیا۔ اچھا جبھی تو آرام طلب ہو گئی ہے۔ہاں ہاں آرام طلبی نہیں تو اور کیا آنٹی نے چٹختے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔شاید وہ ساتھ بیٹھے وجود کو یکسر فراموش کر چکی تھیں۔لوگ تو گریجویشن کے ساتھ ہی جاب کر لیتے ہیں اس کی پتہ نہیں کتنی تعلیم ہے جو ختم ہو کے نہیں دے رہی۔مزید اضافہ کیا گیا۔اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔اتنے میں ان کی باری بھی آ گئی اور وہ غائب دماغی کی حالت میں آنٹی کی فائل اٹھائے ان کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔اس کا ذہن اس کے جسم کا ساتھ نہیں دے رہا تھا نجانے ڈاکٹر کیا پوچھ رہا تھا اور آنٹی کیا جواب دے رہی تھیں اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔وہ اسی کھوئی کھوئی کیفیت میں اتھل پتھل دل کے ساتھ گھر پہنچی۔جیسے تیسے آنسو پیتی گھر کے کام نمٹا کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔اسے پچھلے پندرہ سالوں کی ایک ایک آرام طلبی یاد آنے لگی۔اس کے دل سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔اسے اپنی ساری شادی شدہ زندگی کے بیتے ماہ و سال آنسوؤں میں تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔مقام شکر تھا کہ میاں صاحب ایک ہفتے کیلئے آفس کی طرف سے بیرون ملک گئے ہوئے تھے ورنہ اسے رونے کا موقع بھی نہ ملتا اور اس کا دل خاموشی سے پھٹ جاتا۔

شادی کے بعد سسرال اور بچوں کی ذمہ داریوں میں کھو کر وہ تو اپنا آپ یکسر فراموش کر چکی تھی۔اس نے اپنا آرام سکون گھر بھر کے سکھ کیلئے تج دیا تھا۔کس کو کھانے میں کیا پسند ہے اور کون کھانے کی میز پر کس چیز کو دیکھ کر منہ بنا لیتا ہے اسے یہ سب ازبر ہو چکا تھا۔اگر بھولا تھا تو صرف یہ کہ اسے خود کیا پسند تھا۔بہت سوچنے پر بھی وہ خالی الذہن ہی رہی۔وہ کھانا بھی تو اتنی عجلت میں اور چلتے پھرتے ہوئے بڑے بڑے لقمے لیتے ہوئے نگلتی تھی کہ اسے محسوس تک نہ ہوتا کہ اس نے کیا کھایا ہے اور آیا وہ مزے کا تھا بھی کہ نہیں؟ کسی کو پانی چاہیئے تو کسی کو ٹشو پکڑانا ہے کبھی دروازے کی گھنٹی بج اٹھتی تو کبھی کوئی اور کام نکل آتا۔ وہ ایک روٹی کو نجانے کتنی ہی قسطوں میں ختم کرتی تھی۔ پورے گھر کو آزادی حاصل تھی کہ دن رات میں سے جس وقت چاہے اسے آواز دے لے کوئی بھی کام کہہ لے۔بچے الگ پھیلاوا چھائے رکھتے۔ایسی دوڑتی بھاگتی زندگی میں اس کی دوستیاں اس کے سب رشتے اس سے دور ہو چکے تھے۔اگر کوئی اسے اپنے ساتھ شاپنگ پر چلنے کا کہے یا اور کسی پروگرام میں شامل ہونے کا کہے تو اس کے پاس ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ میں بھلا کیسے گھر سے نکل سکتی ہوں اماں جی کو وقت پہ دوا کون دے گا؟ گھر کے کام ڈسٹرب ہو جائیں گے۔رفتہ رفتہ سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنے حقوق سے خوشی خوشی دستبردار ہو کر فرائض کی انجام دہی میں جت گئی تھی۔جنید اسے اس طرز عمل پر کئی مرتبہ ٹوک چکے تھے کہ اپنی حالت تو دیکھو کبھی تو اپنا بھی خیال رکھا کرو تو وہ ہنس دیتی کہ اپنوں کا

خیال رکھنا اور اپنا خیال رکھنا ایک ہی بات ہے۔سب کی خوشی میں میری خوشی ہے۔اس کے منہ میں بھی زبان تھی انکار کرنا بھی جانتی تھی لیکن اسے سب کے کام آنا اچھا لگتا تھا۔وہ چاہتی تھی کہ اس کی ذات سب کیلئے سکھ کا باعث بنے۔گھر بھر کو وقت پر ہر ضرورت کی چیز ملتی۔کبھی ایسا نہ ہوا کہ کھانے کا وقت ہو اور کھانا تیار نہ ہوا ہو۔کسی نے نہانا ہو اور اس کے کپڑے غیر استری شدہ رکھے ہوں۔اس طرح کے بیشتر کام کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ کب اور کیسے ہو جاتے ہیں۔اس کے شوہر جنید صبح آفس کیلئے نکلتے تو کہیں شام کو سات بجے کے بعد ہی گھر واپس آپاتے۔انہیں تو گھر کے بکھیڑوں کیلئے فرصت ہی نہ تھی۔پھر آنٹی تھیں جنید کی والدہ جنہیں کمر کے درد اور ہائی بلڈ پریشر نے کسی کام کا نہیں چھوڑا تھا۔اماں جی تو بالکل بیڈ پر تھیں۔یہ آنٹی کی خالہ تھیں ان کی شادی نہ ہوئی تھی۔ان کا اس گھر کے لوگوں کے سوا کوئی خیال رکھنے والا نہ تھا۔وہ ستر اسی کے پیٹے میں تھیں اور ضعیفی کے سبب اپنا کوئی کام خود نہ کرسکتی تھیں۔اب تو ہوش وحواس بھی جاتے رہے تھے لہٰذا وہ ہر کام کیلئے خدا کے بعد روحینہ کی ہی محتاج تھیں اور گاہے بگاہے اپنے کاموں کیلئے اسے پکارتی رہتی تھیں۔روحینہ کے دو بچے طیب اور الوشے بالترتیب تیسری اور چوتھی جماعت میں پڑھ رہے تھے۔وہ علی الصبح مؤذن کی آواز پر بیدار ہو جاتی اور نماز کے بعد کام میں جت جاتی تھی گھر بھر کو ناشتہ بنا کر دینا بچوں کو سکول کیلئے تیار کرنا۔میاں کو بروقت کپڑے اور ناشتہ دے کر آفس روانہ کرنا کام والیوں کے ساتھ الگ پیچ کرنا پڑتی کیونکہ دھیان نہ دو تو کام میں ڈنڈی مار جاتی ہیں۔اماں جی کی دوائیوں کے اوقات اور غذائی چارٹ کی ترتیب اسے ازبر تھی۔ان پندرہ برسوں میں کوئی رات ایسی نہ آئی تھی جب وہ ان کو دوا دیے بنا سوگئی ہو یا ان کے کسی اور کام میں اس نے کوتاہی برتی ہو۔ان کی خوراک اور فروٹ کا الگ ٹائم ٹیبل تھا انہیں وقت پر ہر چیز مہیا کرنا روحینہ کی ذمہ داری تھی وہ ضروریات کیلئے غسل خانے تک نہ جاسکتی تھیں۔کتنے سالوں سے ان کے بیڈ کے ساتھ پاٹ رکھنے اور اٹھانے کا کام اس کے سپرد تھا۔اس سب کے باوجود بھی اس کے ماتھے پر بل نہ آیا تھا۔اس طرح کے ہزاروں کام نمٹاتے اسے شام ہو جاتی تھی۔وہ سب کام خوش اسلوبی سے اپنا فرض سمجھ کر کرتی۔اسے اپنے حالات سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔اس نے کبھی کسی پر احسان نہ جتایا تھا لیکن اتنا تو اس کا حق تھا کہ کم از کم اسے آرام طلب نہ سمجھا جائے۔ایسی صورت میں اس سے جاب کی امید رکھنا ہی مضحکہ خیز تھا لیکن آنٹی نجانے کیوں ایسی بات کرکے اس کا دل جلاتی تھیں۔رہ گئی بات دو نوکروں کی تو اس کا جی چاہا کہ جاکر ان سے پوچھے کہ اگر ان کا گھر نوکروں پر ہی چل رہا ہے تو مہینوں بعد کہیں ایک ہفتے کیلئے امی کی طرف چلی جاؤں تو واپسی پر آپ کی کمر کیوں دوہری ہوئی ہوتی ہے؟ گھٹنا کیوں دکھ رہا ہوتا ہے؟ سب گھر کی روٹی اور پراٹھوں کو کیوں ترسے ہوتے ہیں؟ سارے گھر کا نظام کیوں درہم برہم ہوا ہوتا ہے؟ ہر طرف غیر استری شدہ کپڑوں کے ڈھیر اور دیگر چیزیں کیوں بکھری ہوتی ہیں؟ کاش آنٹی جی کبھی آپ نے غور کیا ہوتا کہ کس کے بھروسے گھر چھوڑ کر آپ اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں کو مکمل وقت دیتی ہیں اور بڑھاپے میں جوانوں کی سی بے فکری کے دن گزار رہی ہیں؟ لیکن وہ ایسے سوال پوچھنے کیلئے کسی کو کٹہرے میں نہ گھسیٹ سکتی تھی نہ ہی ہاتھ نچا نچا کر جاہل عورتوں کی طرح کوسنے دے سکتی تھی۔اس کام میں اس کی تہذیب اور شرافت جو آڑے آجاتی تھی۔وہ فقط آنسوؤں میں اپنا غبار منتقل کرسکتی تھی سو وہ کر رہی تھی لیکن آنسو تھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔کتنا وقت ہو گیا تھا اسے ٹی وی دیکھے،ایک زمانہ تھا جب ہر ڈرامہ دیکھنا جیسے اس پر فرض تھا۔اسے ڈرامے دیکھنے کا بہت شوق تھا مگر وہ تو گئے دنوں کی بیتی کہانی تھی اب تو ڈرامے کے وقت وہ کچن میں کھڑی رات کا کھانا بنا رہی ہوتی تھی۔اتنے برسوں میں اسے کبھی اتنا احساس بھی تو نہ ہوا تھا۔وہ تو اسی خوشی میں مگن تھی کہ اس کے گھر والے اس سے خوش ہیں لیکن آج اس ایک لفظ نے اس کا سارا مان توڑ دیا تھا۔اس کے پندرہ برسوں کی خدمت گزاریوں اور جی حضوریوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔

اسے یوں لگا جیسے 'آرام طلب' کوئی لفظ نہیں بلکہ بھاری سا پتھر ہے جس نے اچانک اس کے نازک سے دل پر گر کر اسے چکنا چور کر دیا ہے۔ایک بار تو شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ سب ذمہ داریوں سے آنکھیں پھیر کر واقعی نوکری کرلے۔صبح آرام سے خود ناشتا کرکے گھر سے نکل جایا کرے اس بات سے قطع نظر کہ پیچھے گھر والے کیا کھائیں گے؟ بچوں کیلئے لنچ کون تیار کرے

گا؟ گھر بھر کی ڈسٹنگ اور صفائی کون کرے گا؟ ماسیوں سے کپڑے اور برتن کون دھلوائے گا؟ یہاں تک کہ بستر پہ پڑی اماں جی کی دوا اور خوراک کے اوقات کو بھی فراموش کر دے۔ لیکن نہیں وہ بھلا یہ سب کیسے کرسکتی تھی۔ اس کا ضمیر ابھی زندہ تھا۔ اسکا حساس دل بھلا کیسے یہ خودغرضی گوارا کرسکتا تھا۔ گھر کے افراد میں ایک وہی تو ذمہ دار ہستی تھی جو سب کا خیال رکھ رہی تھی چاہے کوئی اس بات کا اقرار کرے یا نہ کرے وہ خود اپنی اہمیت سے آگاہ تھی۔ روشنیہ کی طمانیت کیلئے یہی کافی تھا کہ جنید اس کی خوبیوں کے معترف تھے اور برملا سراہتے بھی رہتے تھے۔ آئے گئے والا گھر تھا اکثر کوئی نہ کوئی فیملی ان کے ہاں ڈیرے ڈالے ہوئے ہوتی۔ روشنیہ ماتھے پر بل ڈالے بنا سب کی خاطر داری کرتی۔ دیکھنے والے رشک کی نگاہ سے دیکھتے اور دعائیں کرتے کہ ہمیں بھی ایسی ہی بہو ملے ۔ یوں تو آنٹی بھی کوئی ایسی ظالم ساس نہ تھیں لیکن کبھی کبھی اس کی تعلیم اور نوکری نہ کرنے کے موضوع کو لے کر کچھ نہ کچھ ایسا بول جاتی تھیں کہ اس کے دل پر چوٹ پڑتی۔ نجانے وہ اس بات کو کیوں نہ سمجھتی تھیں کہ اس کے پاس جاب کیلئے وقت نہیں ہے یا اس پر گھر کے کاموں کی ذمہ داری ہے۔ وہ ان کی باتوں پر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ جس تعلیم کی بناء پر طعنے اور طنز کے ڈونگرے اس پر برسائے جاتے تھے وہ اس نے جس مشکل سے حاصل کی تھی یہ تو اس کا جی جانتا تھا۔ پرائیویٹ پڑھنا یوں بھی بڑے دل گردے کا کام ہے اوپر سے جوائنٹ فیملی سسٹم کی ذمہ داریاں، لیکن یہ ایک واحد مشغلہ تھا جو اس نے خود پر جبر کر کے جاری رکھا ہوا تھا۔ جنید بھی اس معاملے میں اس کے ہمنوا تھے کیونکہ وہ جانتے تھے یہ ایک بے ضرر شوق ہے جس کی وجہ سے کبھی وہ خود، ان کا گھر یا گھر والے کبھی نظر انداز نہ ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جنید اکثر اس کی تعلیم کا ذکر اتنے فخریہ انداز میں کرتے تھے کہ سن کر روشنیہ کا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔ اس رات اسے اپنی پڑھائی کی مشکلات بھی رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں۔ عین پیپرز کے دنوں میں کوئی نہ کوئی مہمان آ جاتا اور کاموں میں الجھ کر اسے پڑھنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ دن بھر مہمانوں کی خاطر داری کے بعد رات کو تھکے ہوئے جسم کے ساتھ وہ نوٹس پر چند نظریں ہی گھما پاتی اور بس۔ یہ غنیمت تھا کہ پرائیویٹ طلبہ کے پرچے سیکنڈ شفٹ میں ہوتے ہیں۔ روشنیہ دوپہر کو جلدی جلدی گھر والوں کو کھانا کھلا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتی امتحانی سینٹر کا رخ کرتی۔ انگلیوں کے ناخنوں سے آٹا کھرچتی کمرہ امتحان کی جانب بڑھتی چلی جاتی اور جلدی سے اپنا رول نمبر تلاش کر کے پیپر دینے بیٹھ جاتی۔ پیپر دینے کے بعد جب گھر پہنچتی تو رات کے کھانے کا وقت سر پر ہوتا اور وہ کسی سے کچھ کہے بنا کچن میں گھس جاتی اور معمول کے مطابق کھانے کا انتظام کرنے لگتی۔ کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ایسے موقع پر کسی نے اپنی خدمات پیش کی ہوں نہ ہی اس نے کبھی ایسی توقعات رکھی تھیں۔ وہ اپنے حال میں مگن تھی۔ اس کے خیال میں تعلیم اس کا ذاتی معاملہ تھا اور چونکہ یہ بکھیڑا اس نے اپنی مرضی سے پالا تھا تو وہ اس سلسلے میں کوئی ایسا حق نہ رکھتی تھی کہ دوسرے اس کے اس معاملے میں لاڈ اٹھائیں۔

اسے رہ رہ کر وہ راتیں یاد آنے لگیں جو اس نے جاگ کر لیمپ کی روشنی میں کتابوں پر سایہ فگن گزاری تھیں۔ دن طلوع ہونے پر بھی کسی کو جتائے بغیر روزمرہ کے کام حسب معمول انجام دیئے تھے ۔ ساسیں اپنی بہوؤں کو اس کی مثالیں دیا کرتیں۔ مائیں بیٹیوں کو گھرکتیں کہ روشنیہ کو دیکھا ہے کیسے بھاگ بھاگ کر سارے کام کرتی ہے تم بھی کچھ گن سیکھو۔ وہ اس قسم کی سرگوشیاں سن کر زیر لب مسکراتی رہتی اور اللہ کا شکر ادا کرتی جس نے اسے یہ قابلیت بخشی تھی۔ یہ تو اسے آج معلوم ہوا تھا کہ چراغ تلے کتنا اندھیرا ہے۔ اور تو اور گھر میں کام کرنے والی ماسی نے بھی محلے بھر میں اس کی اطاعت شعاری اور خدمت گزاری کے چرچے پھیلا رکھے تھے۔ ارد گرد کے لوگ اسے شفقت اور محبت سے ملتے اور توصیفی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس کے پاس تو کبھی اتنا وقت ہی نہ ہوتا کہ محلے میں دوستیاں پالتی یا غمی خوشی کے علاوہ کسی کے ساتھ آنا جانا کر سکتی۔ بیتے دنوں کے مناظر اس کے ذہن کی اسکرین پر ابھرتے اور گم ہوتے گئے۔ اس کی آنکھیں برستی رہیں۔ نجانے کتنے گھنٹے بیت چکے تھے اسے اسی حالت میں ساکت اور جامد بیٹھے ہوئے۔ فجر کی اذان گونجی تو وہ جیسے گہرے خواب سے چونک گئی ساری رات آنکھوں میں کٹ چکی تھی اور آرام طلب کے جاگنے کا وقت ہو چکا تھا اس نے ایک محبت بھری نظر ساتھ سوئے ہوئے بچوں پر ڈالی اور وضو کر کے نماز کیلئے کھڑی ہو گئی وہ اپنے پھول سے بچوں کے صدقے دل میں چبھے کانٹے معاف کر چکی تھی۔

دی گریٹ راوین اُستاد...... پروفیسر صابر لودھی

محمد ساجد

پروفیسر صابر لودھی ۱۲ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ہوشیار پور (مشرقی پنجاب ، ہندوستان) کے ایک گاؤں مہاجری سیاپہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالستار خان متحدہ ہندوستان کے زمانے میں ایک سکول میں استاد تھے۔ ان کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی ۔ پروفیسر صابر لودھی، حضرت علاؤالدین صابر پیا کے مجاور کی دعا سے پیدا ہوئے اور اس کے ایماء پر آپ کا نام محمد صابر علی رکھا گیا۔ یوں محمد صابر علی خان لودھی ، زمانے میں پروفیسر صابر لودھی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا بچپن ہوشیار پور میں گزرا۔ قیام پاکستان کے بعد ضلع مظفر گڑھ میں رہائش اختیار کی۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ ہائی سکول علی پور ضلع مظفر گڑھ سے میٹرک پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ انٹر کالج مظفر گڑھ اور ۱۹۵۴ء میں بی۔ اے ایمرسن کالج ملتان سے پاس کیا۔

شعروادب سے دلچسپی ان کو اورینٹل کالج ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور لے آئی ۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج ، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے مایہ ناز اساتذہ پڑھاتے تھے۔ پروفیسر صابر لودھی نے ۱۹۵۶ء میں اسی درس گاہ سے ایم ۔ اے اردو کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ ان کے تھیسز کا عنوان ”اردو ادب میں مثنوی کا ارتقاء“ تھا۔ ۱۹۵۸ء میں اسی مادر علمی کے شعبہ فارسی سے ایم۔ اے فارسی کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

۱۹۵۸ء میں ہی اٹچیسن کالج لاہور میں بطور اردو لیکچرر پروفیسر صاحب کی تعیناتی ہوئی۔ ۵۹۔۱۹۵۸ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کا امتحان دیا اور پنجاب بھر میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۵۹ء میں میونسپل کالج اوکاڑہ میں اپنی تدریسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۱ء میں میونسپل کالج اوکاڑہ سے تبادلہ کروا کر گورنمنٹ ڈگری کالج مظفر گڑھ میں چلے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں ہی پروفیسر صابر لودھی ، گورنمنٹ کالج ، لاہور جیسی شاندار روایات کی امین درس گاہ میں وارد ہوئے ۔ اسی سال گورنمنٹ کوئین میری کالج ، لاہور کی چیف لائبریرین فرخندہ لودھی سے شادی کی۔ یوں اردو ادب میں نئی ادبی جوڑی کا اضافہ ہوا۔ وہ اپنی شخصیت اور اپنے انداز گفتگو کے سبب راوینز میں چھائے رہے۔

۱۹۶۶ء میں پروفیسر صابر لودھی جنرل سیکریٹری، ویسٹ پاکستان لیکچرار ایسوی ایشن منتخب ہوئے اور صدر ایوب خان کے خلاف چلنے والی بحالی جمہوریت کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ ویسٹ پاکستان لیکچرار ایسوی ایشن کے بینر تلے اولڈ کیمپس کے صدر دروازے کے باہر بھوک ہڑتالی کیمپ لگا ہوا تھا جہاں پروفیسر صاحب اور ان کے رفقاء ایوب خان کے خلاف نعرے لگاتے تھے۔ اس کے استعفیٰ کے ساتھ یہ کیمپ بھی ختم ہو گیا۔ ۱۹۷۳ء میں پروفیسر صاحب کو اسسٹنٹ پروفیسر اور ۱۹۸۶ء میں ان کو ایسوسی ایٹ پروفیسر کا گریڈ ایوارڈ ہوا۔ انھوں نے ۱۹۸۶ء میں علمی، ادبی اور فکری میگزین مجلہ راوی کے نگران کے طور پر کام شروع کیا اور مجلہ راوی کے بہترین نمبرز نکالے جن میں نمایاں تر راوی کا صدی نمبر بھی شامل ہے۔

وہ چھتیس سال تک گورنمنٹ کالج لاہور بطور پروفیسر آف اردو راوینز کو پڑھاتے رہے اور ۱۲ دسمبر ۱۹۹۳ء میں ریٹائرڈ ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور جیسی وطن عزیز کی عظیم الشان درس گاہ میں اتنے سالوں تک تعلیمی و تدریسی فرائض سر انجام دینا کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ اس ادارے میں کم علم اور عام استاد کا پڑھانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ۱۹۹۳ء میں ہی پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب، پروفیسر صابر لودھی کو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ اردو میں بطور جز وقتی استاد لے گئے۔ بعد ازاں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ان کے دورانیے میں اضافہ کر دیا۔

۲۰۱۳ء میں پروفیسر صاحب کو جز وقتی استاد کی ملازمت سے ہٹا دیا گیا۔ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ اردو کے بدلتے ہوئے ماحول اور حالات و واقعات نیز تین بڑوں کی انا نے ان کے لیے بہت مشکلات پیدا کر دی تھیں

۔ یوں اس نابغۂ روزگار شخصیت کو گھر بیٹھنا پڑا۔ فرخندہ لودھی کی وفات (۵ مئی ۲۰۱۲ء) نے ان کو پہلے ہی تنہا کر دیا تھا۔ دل کے روگ نے ان کو آن گھیرا اور وہ اس روگ کے ہاتھوں ۳۰ دسمبر ۲۰۱۲ء بروز منگل شب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ان کی سوانح عمری ''ہمارے بعد'' جو کہ ظہیر کاشمیری کے شعر سے ماخوذ تھا، نامکمل رہ گیا۔ اس کی فقط پانچ اقساط ماہنامہ ''الحمراء'' میں چھپ پائیں تھیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انھوں نے ایک قلمی نام ''ابن السبیل'' اختیار کیا اور ''ادب بے ادب'' کے عنوان کے تحت فکاہیہ کالم لکھے جن میں چاپلوسی کرنے والے ادیبوں کی خوب درگت بنائی۔

انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ رہنے والے افسانہ نگاروں کے بہترین افسانوں کو ''راوی افسانے'' کے عنوان کے تحت مرتب کیا اور خود ہی اس انتخاب کے لیے ایک زبردست مضمون بعنوان ''راوی کی موجیں'' لکھا جو کہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے ایک انشائیہ ''انتظار کا موسم'' لکھا جس کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے اس انشائیہ کو اردو ادب کے بہترین انشائیوں میں شمار کیا ہے۔ ان کی زندگی کی آخری تحریر میری کتاب ''نائن الیون۔ حقیقت سے اردو افسانے تک'' پر لکھا گیا دیباچہ ہے جو میں نے بڑی محبت سے لکھوایا تھا اور انھوں نے بڑی محنت کے ساتھ لکھا تھا۔

تحقیقی اور تنقیدی لحاظ سے ان کا کام بکھرا پڑا ہے۔ چند مضامین جو میں تلاش کر پایا ہوں ان کی رنگ تفصیل کچھ یوں ہے تنقید کا جمالیاتی دبستان، ہومر۔۔۔ ایک مطالعہ، مولانا روم (شخصیت اور فن)، شیکسپیئر کی شاعرانہ عظمت، سارتر اور فلسفہ وجودیت، احمد فراز۔۔۔ رومان سے مزاحمت تک، شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کا بہت سا تحقیقی اور تنقیدی کام سامنے لانے کی ضرورت ہے اور یہ ان لوگوں پر فرض اور قرض ہے جن کے پاس ان کا کام پڑا ہے کہ وہ اس کو سامنے لائیں۔

ان کی ایک ہی کتاب ''بھلایا نہ جائے گا'' ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی جو خاکوں پر مشتمل تھی ایک عجیب و غریب بات جو ان کی زندگی سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے، وہ تین یا تھس کا ہندسہ ہے۔ وہ ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک سے ایم اے تک ان کا رول نمبر تھس رہا۔ پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں ان کی نمبر تین پوزیشن آئی۔ وہ ۳۰ دسمبر کو فوت ہو گئے۔ وہ تین یا تھس کو اپنا لکی نمبر قرار دیتے تھے۔ ان کے ہونہار شاگردوں کے بقول ''گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو ادب میں ایسے استاد بہت کم رہے ہیں جو طالب علموں کا دل جیت لیتے تھے اور کلاس روم میں چھا جاتے تھے۔ پروفیسر صابر لودھی ان میں سے ایک تھے۔''

آخر کار کہنا پڑتا ہے کہ ''ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم''

عابد جاوید مغل/مسقط (عمان)

کہا ہے ہم نے اشکوں سے جو لازم ہو سفر کرنا
مرے دل تک چلے آنا نہ پلکوں کو خبر کرنا

یہ مانا کہ کئے لیے جگر کا خون کرتے ہیں
کبھی دل سوز آہوں کو کہاں ممکن زبر کرنا

کبھی میں دل سے کہتا ہوں گئی گزری بھلا ڈالو
مگر پھر خود ہی کہتا ہوں نہ ایسا کچھ مگر کرنا

دلوں کے مسئلوں سے کچھ خطا شاید ہماری ہو
مناسب اُس نے سمجھا ہو ہمارے بن بسر کرنا

مغل منسوب اپنے آبلوں کو اُن سے کیوں کر دوں
خدا کے بس میں ہوتا ہے کسی کو دربدر کرنا

....

سنا تو ہوگا مری زباں سے کبھی محبت کی ابتدا میں
کہ جاں گئی نہ سہہ سکو گے کچھ ایسا ہوتا ہے انتہا میں

وہ تیرا میرا تھا قرب ایسا کہ جان جاتی گلہ نہ کرتے
ذرا سی دوری پہ دل سے مجھ کو اچھال ڈالا ہے اس فضا میں

وہی ہو تم ہاں جو سر کو سینے پہ رکھ کے مجھ سے یہ کہہ رہے تھے
کہ دونوں ایسے صدا بنیں گے کہ جیسے خوشبو چلے ہوا میں

بھلانا چاہو تو کر لو کوشش مجھے یقیں ہے نہ کر سکو گے
کہ میں تو خوشبو میں بس چکا ہوں تری ردا میں تری فضا میں

جو جھوٹ بولو تو کہہ دو ایسا کہ تم نے مجھ کو بھلا دیا ہے
مگر یہ مانو کہ سچ یہی ہے مغل ہے شامل ہر اک صدا میں

افسانہ

پھانسی

داؤد کاکڑ

عزت مآب جج مظہر علی کے کرسی سنبھالتے ہی کمرہ عدالت میں قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔ دس سالہ بچی کے ساتھ جنسی زیادتی اور قتل کا کیس جس نے سال بھر سے پوری قوم کو لپیٹ میں لے رکھا تھا اس کے فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ ابتدا سے لے کر اب تک طرح طرح کے تنازعات جن میں گواہان کا اپنے بیانات سے منحرف ہونا، مجرم کا اقبال جرم کرنے کے بعد اپنی بے گناہی پر اڑ جانا اور جج کا میڈیا کو کمرہ عدالت سے کیس کی تکمیل تک نکال دینا شامل ہیں، کا شکار رہنے کے باوجود کسی کو بھی صحت جرم اور مجرم کے گناہگار ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ ہاں...... فاضل جج سزا کیا تجویز کرتے ہیں؟ یہ بات البتہ خاص و عام کے لیے باعث تجسس تھی۔ مجرم کو پھانسی کی سزا ملنا چاہیے۔ اس پر اکثریت کا اتفاق تھا لیکن عوام الناس کا ایک بڑا حصہ سزائے موت کے سراسر خلاف تھا۔ ان کی رائے میں مجرم کو بقیہ زندگی قید و بند کی سختیوں اور صعوبتوں میں بتانا چاہیے کہ وہ اسی کا حقدار تھا۔

کٹہرے میں کھڑے مجرم کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے یکسر خالی تھا۔ وکلاء اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان تھے۔ آنریبل جج مظہر علی نے آج میڈیا کو بھی اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ کمرہ عدالت میں مظلوم بچی کی بیوہ ماں اپنے بھائی کے ساتھ حاضر تھی۔ جبکہ مجرم کے با اثر والدین بھی اپنے حواریوں کے ساتھ موجود تھے۔

جج نے سر اُٹھا کر ایک سرسری نظر کمرہ عدالت میں دوڑائی اور پھر مختصر الفاظ میں فیصلہ صادر کر دیا۔

مجرم کو عدالت میں پیش کیے گئے شواہد میں شک و شبہات کی بنیاد پر بری کر دیا گیا۔

خبر آناً فاناً میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور پورے ملک میں ایک ماتم کا سا عالم چھا گیا۔ میڈیا کے لیے یہ "بریکنگ نیوز" تھی سو سب نے روایتی انداز میں اور ریٹنگ کی ریس کے لیے خوب ہنگامہ کیا لیکن عوام و خاص میں زیادہ تر مایوسی اور خاموشی کا عالم طاری رہا اور سارا دن پورے ملک کا ماحول سوگوار رہا۔

اگلی صبح شہر کے بڑے چوک میں الیکٹرک پول پر پھانسی پر لٹکی لاش کو اُتار کر اس کی چہرہ کشائی کی گئی تو وہ لاش جج مظہر علی کی تھی۔

اجمل ساقی / مسقط (عمان)

اجمل ساقی کا تعلق لالہ موسیٰ (گجرات) سے ہے۔ گزشتہ دس برس سے سلطنت آف عمان میں قیام پذیر ہیں۔ ایک عرصہ تک فائن آرٹس کے شعبہ سے منسلک رہے۔ ایک اچھے آرٹسٹ کے ساتھ ساتھ خوش نویس اور خوش گو بھی ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ "اسیر چشم" 2012ء میں شائع ہوا۔

....

اک شخص ہی تو ہے وہ زمانہ تو ہے نہیں
یہ اور بات ہم نے بھلانا تو ہے نہیں
الزام ہم پہ ہے کہ ریاکار ہیں بہت
اُس نے بھی اپنی جان سے جانا تو ہے نہیں
کھڑکی میں تیرا اُوحند میں آنا فضول ہے
اس رُت میں چاند کچھ نظر آنا تو ہے نہیں
کچھ تو شکار بھی ہے متحرک مگر چلو
اپنا بھی کوئی خاص نشانہ تو ہے نہیں
بہتر یہی ہے اپنی ہی تحویل میں رکھو
ویسے بھی ہم نے اب کہیں جانا تو ہے نہیں
لاہور کیسا ہے اُسے اتنا بتایا ہے
لاہور ہم نے اُس کو دکھانا تو ہے نہیں

....

کاٹ کر پنکھ پرندوں کو اُڑانے والے
یعنی اوقات دکھاتے ہیں دکھانے والے
گر بھی سکتا ہے یہ ملبہ تو ابھی پہ واپس
مر بھی سکتے ہیں یہ دیوار اُٹھانے والے
دیکھ پہلے کہ طلب کیا ہے خریداروں کی
اپنی مرضی کا ہمیں مال دکھانے والے
کچھ تو سائل کی خودی کا بھی بھرم رکھ لے یار
صبح سے شام تلک در پہ بٹھانے والے
تیرے سامان سے اب کپڑے نکالے جائیں
تھوڑی تعریف پہ دام اپنے بڑھانے والے
بے وفا ہو گئے مجبوری کے ہاتھوں وہ بھی
زندگی میں تھے جو چند لوگ نبھانے والے
اس کا مطلب تو ہے انکار ہی سمجھا جائے
میری ہر بات پہ بیزاری دکھانے والے
کس طرح بھولوں تمہیں کیسے تمہیں جانے دوں
میرے ہم راز مرے عیب چھپانے والے

....

شاعری (غزل، نظم)

میں فانی ہوں کہ لافانی، نمی دانم نمی دانم
اے میرے یارِ من جانی، نمی دانم نمی دانم

سرِ محفل تری رسوائی کا باعث نہ بن جائے
یہ میری چاک دامانی، نمی دانم نمی دانم

ابھی تک پردۂ اسرار میں تخلیقِ آدم ہے
یہ فانی ہے کہ لافانی، نمی دانم نمی دانم

فصیلِ ذات میں کس دم مجھے محصور کر ڈالے
مجھے میری تن آسانی، نمی دانم نمی دانم

مبادا یہ کسی بنجر زمیں کے کام آ جائے
یہ میری اشک افشانی، نمی دانم نمی دانم

اگر واقف ہے یہ دنیائے دوں کی بے ثباتی سے
تو کیوں خلقت ہے دیوانی، نمی دانم نمی دانم

ترے دربار تک ہر چند میری بھی رسائی ہے
مگر آدابِ سلطانی، نمی دانم نمی دانم

مری خورشید مرزا باوجود ضعفِ جسمانی
طبیعت کیوں ہے سیلانی، نمی دانم نمی دانم

خورشید بیگ میلسوی/ میلسی

چور چھپ کر دلوں میں رہتے ہیں
لوگ اب یوں گھروں میں رہتے ہیں
جو تری قربتوں میں رہتے ہیں
گویا وہ جنتوں میں رہتے ہیں
دھند میں آنسوؤں میں رہتے ہیں
ہم بھیگی بادلوں میں رہتے ہیں

آپ آ جائیں شوق سے آئیں
ہم ذرا خلوتوں میں رہتے ہیں
کیا خبر وہ ہمیں نہ پہچانے
ہم ابھی انجمنوں میں رہتے ہیں
ان کی زندہ دلی کا کیا کہنا
جو شکستہ دلوں میں رہتے ہیں
وہ جو اندر سے ہو گئے تنہا
دیر تک محفلوں میں رہتے ہیں
شہر اب دشمنوں کا جنگل ہے
ہم کہاں دوستوں میں رہتے ہیں
چھٹ کو لگتی ہے اپنی غفلت سے
حادثے لغزشوں میں رہتے ہیں
ہم کو موجود میں تلاش نہ کر
ہم تو گزرے دنوں میں رہتے ہیں
جگنو، تتلی، پنچھی، پروانے
سب کہاں بارشوں میں رہتے ہیں
وہ کہیں اور کے نہیں رہتے
جو تری صحبتوں میں رہتے ہیں
ان کو چلنا سکھائیں کیا رستے
جو فقط دائروں میں رہتے ہیں
منزلیں ان کی منتظر ہیں امر
جو سدا راستوں میں رہتے ہیں

عرفانہ امر/ گوجرانوالہ

اوہ کھلی سی کتاب ہے میری جاں
میری آنکھوں کا خواب ہے میری جاں
کیا بتاؤں، بتا نہیں سکتا
اس قدر لاجواب ہے میری جاں
حسن کی شہزادیوں سے کہو
حسن کا اک باب ہے میری جاں
میرا سارا سفر حسیں ہوگا
اب میری ہم رکاب ہے میری جاں
آج موسم میں تازگی سی ہے
دیر سے بے نقاب ہے میری جاں
ایک شیشے کا جام ہے میرا دل
اور چھلکتی شراب ہے میری جاں
مجھکو سیراب کرتی رہتی ہے
جیسے چڑھتا چناب ہے میری جاں
میں بھی بھنورے کی مثل ہوں جابر
اور مثلِ گلاب ہے میری جاں

جابر نظامی/ ٹیکسلا

دوستوں کے درمیاں یہ بدگمانی کیا ہوئی
جو وفا کی ترجماں تھی وہ کہانی کیا ہوئی
جھولیاں بھر بھر کے حسرت دے رہے ہیں ہم نفس
میری قسمت میں مسرت کی گرانی کیا ہوئی
بوجھ بن کر رہ گئے ہم انجمن میں یک بیک
اس سخنور سے ہماری ترجمانی کیا ہوئی
پھول سے ہاتھوں پہ چھالے پڑ گئے ہیں جا بجا
اے امیرِ وقت تیری حکمرانی کیا ہوئی

دل کے صحرا کو اگر سیراب کر نہ پائیں تو
آبشاروں کی روانی پھر روانی کیا ہوئی
رقص ہے جاری فضا کا جس طرف بھی دیکھیے
تھی یہاں جو موج میں وہ زندگانی کیا ہوئی
آخری پتا بھی شاہد شاخ سے رخصت ہوا
باغباں سے پوچھیے یہ رائیگانی کیا ہوئی

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

اپنی دہلیز پہ گلدان برابر رکھے
پھر ترے آنے کے امکان برابر رکھے
وہ مجھے چھوڑ گیا رنج نہیں، رنج ہے یہ
اُس نے باندھے ہوئے پیمان برابر رکھے
لوگ اب نام ونسب نام کرتے ہیں
خالقِ ہست نے انسان برابر رکھے
ایک جنگل مرے اطراف اُگا جاتا ہے
ایک صحرا مجھے سنسان برابر رکھے
اپنی راہوں کی قیامت سے اُلجھتا بھی رہا
اور منزل کے بھی ارمان برابر رکھے
پیکرِ خام کو شاہکار بنانے کے لیے
میرا وجدان پریشان برابر رکھے
میں نے ہونا تھا ہوا شہر بدر اے ساحل
میں نے سچ بول کے نقصان برابر رکھے

ساحل سلہری/سیالکوٹ

روتے روتے سو گئے آخر
تیرے جیسے ہو گئے آخر
شہر تو اس کا پہلے سے تھا
یار بھی اس کے ہو گئے آخر
صبر کی حد سے رات گزر کر
دامن نین بھگو گئے آخر
دیکھ کے موجِ غم میں مجھ کو
پیچھے کو سب ہو گئے آخر
میری آنکھوں سے چل کر آنسو
اس سے ملنے کو گئے آخر
کل شب اس کی یاد کو لے کر
بیٹھے بیٹھے کھو گئے آخر
پھولوں کے خواب دکھا کے
کانٹے یار چبھو گئے آخر
پتھر جیسی خاک میں خالق
بیج وفا کے بو گئے آخر

خالق آرزو/کمالیہ

تب ارادہ ہی نہیں تھا بے ارادہ کر لیا
میں نے اُس سے عشق جب حد سے زیادہ کر لیا
گاڑیاں رُکتی ہیں اب دل کے سٹیشن پر مگر
زندگی کا یہ سفر طے پا پیادہ کر لیا
شام کے سائے ابھی پھیلے نہیں زہرہ بدن
کیا ہوا ہے؟ کیوں بچھڑنے کا ارادہ کر لیا
یوں تو دن بھر خوب تر پوشاک میں ملبوس تھا
شب ہوئی تو خاک کو میں نے لبادہ کر لیا
شاعری کا کچھ ہنر اس نے بھی سیکھا تھا مگر
میرے شعروں سے بھی اُس نے استفادہ کر لیا
جس قدر خوشیاں ملیں گی اُن پہ میرا حق نہیں
دوسروں میں بانٹنے کا خود سے وعدہ کر لیا
تنگ نظری کی ادا کب جانتا ہے آفتاب
اُس نے ہر اک کے لیے دامن کشادہ کر لیا

آفتاب خان/لاہور

یہ کس عذاب کا اب کے نزول ہے لوگو
تمام شہر ہی اپنا ملول ہے لوگو
اگر وہ دھوپ ہی میرا نصیب ٹھہری ہے
تو پھر یہ چھاؤں کی خواہش فضول ہے لوگو
وفائیں بھیک میں لینا ہمیں گوارا نہیں
سو اس کا جبر ہی ہم کو قبول ہے لوگو
میں چاہے جان سے جاؤں یا پھر جہان سے جاؤں
اب اس کے واسطے سب کچھ قبول ہے لوگو
اٹا ہے یادوں کی پرچھائیوں سے ایسے یہ دل
کہ ہر سُو بکھری ہوئی جیسے دھول ہے لوگو
اب اس کے سامنے پھیلائیں کیوں یہ دامنِ دل؟
ہمارا بھی کوئی آخر اصول ہے لوگو
مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ کو کیا ہے
وہ جس طرح کا ہے مجھ کو قبول ہے لوگو
بسا ہوا ہے وہ نوشی مرے رگ و پے میں
اُسے بھلا دوں تمہاری یہ بھول ہے لوگو

نوشین اقبال نوشی/کھاریاں

فاتح

یہ تیری سوچ ہے
یہ تری سوچ ہے کہ میں بے کار ہوں
بے ضرر ہوں مرے دم سے دنیا کو خطرہ نہیں
میں کسی سرحدی دشمنی پر لہو کی لکیریں لگانے کا قائل نہیں
یعنی بزدل ہوں میں
میں شکاری نہیں
میں شکاری کی نظروں میں پھیلی ہوئی فاتحانہ کراہت پہ
کیوں فخر کرتا نہیں
تیری روح کی بے بسی مجھ پہ واضح ہے جب وہ
پرندے کی جانب نشانے پہ مجبور ہو
میں پرندوں کا قاتل نہیں

میں فسادات کروانے کی اہلیت بھی تو رکھتا نہیں
میری تحریر سے لوگ کیوں مشتعل ہو کے لڑتے نہیں
میرے الفاظ میں وہ روانی نہیں جو کہ انسانی لاشوں کو
بحرِ جہنم کی جانب بہالے جائے
یعنی میں بے حسی کے اس عہدِ زیاں کار میں
درد چننے کا ماہر نہیں
میں تو شاعر نہیں

میں تو اپنی ہی سانسوں کو اپنے بدن کی حدوں میں
مقید کیے جانے پر کتنا شرمندہ ہوں یہ مجھے علم ہے
میں بھلا کس طرح نسلِ آدم کو اک حاسدانہ لڑی میں
پرو کے گلے میں سجا کر بڑے فخر سے چلنے والوں کے ساتھ
ایک برتن میں جام محمدؐ پیوں
میں محمدؐ کی اُمت سے ہوں
میں تو قیدی بنانے پہ ایمان لاتا نہیں
یعنی فاتح نہیں

ڈاکٹر وقار خان/ ملتان

تانابانا

کبھی کبھی مجھے باتوں کا ہجوم
بولنے نہیں دیتا
لفظوں کے ڈھیر میرے اردگرد
اپنی سرمئی آنکھیں کھولے حسرت سے تکتے ہیں
کئی رال ٹپکاتے خیال
اپنی لپلپی زبانوں سے مجھے چھوتے ہیں
مجھے اپنی اور متوجہ کرتے ہیں
کبھی کبھی تو طلوعِ آفتاب سے پیشتر
یہ میری ہڈیوں اور گودے میں سما جاتے ہیں
کبھی کبھی تو مجھے دن بھر ان کا رہینِ منت رہنا پڑتا ہے
اور کبھی سرمئی شام کے گھٹتے بڑھتے سایوں میں
جب درخت اندھیارے کی چادر اوڑھ لیتے ہیں
لفظ اپنے سرخ چہروں سے مجھے گھورتے ہیں
ان کی حبس زدہ سانسیں میرا دم گھونٹ دیتی ہیں
پھر یہ میرے بدن کو اپنے خوفناک ناخنوں سے
کریدتے اور لہو کی ریکھاریاں بناتے ہیں
کبھی اپنے خبیث چہرے پر لجاجت سجا کر
میرے ہونے کی گواہی بنتے ہیں
میں اپنے ہی لفظوں کی
دہشت گردی کا شکار ہوں
حروف کا تانا بانا مجھے جکڑے رکھتا ہے
ان کہے جملے گرائمر و انشا کی سب اصطلاحیں
میرا منہ چڑاتی ہیں
مجھے خوف کا شکار کرتی ہیں
میں وجودیت کے فلسفے سے باہر
کسی ناسٹلجیا کا شکار
اپنے ہی روپ سروپ کی گرہیں کھولتے
اپنی ذات کی خارزار جھاڑیوں سے اُلجھی
اک غنودہ سی اُداسی میرے چاروں طرف
کسی عفریت کی مانند اپنے پنجے پھیلائے
دنیا و مافیہا سے بے خبر
اک معصوم سے انکار کی چمک خود پہ سجائے
لفظوں کے گورکھ دھندے میں لپٹی پڑی
آزاد ہونے کی جستجو میں اور اُلجھتی جاتی ہوں
لفظ ادا ہونے سے پہلے ہی
کرچیاں بن کر ٹوٹتے
اور مجھے زخمی کرتے ہیں
کوئی تدبیر کارگر نہیں
زندگی اک سوالیہ نشان کے بیچ اُلجھی ہے
میں لفظوں اور حرفوں کے تانے بانے سے
باہر نکلوں گی تو آسمانِ آرزو پر چمکتے
تمام ستارے گن لوں گی

آستھ کنول/

رقصِ درویشاں

حق درویشی کا طوق لیے
میرے سر کی قرا ٔتی
اور وہ آنکھیں میری
اپنے ہی بدن پر نازاں
بے رنگ، بے سلوٹ
مہین سی عبا کو دیکھتی تھیں
اور وہ آنکھیں میری
جو بے خودی کی روانی میں
اپنی عبا کے سنگ دائرے کھینچتی تھیں
میں سرشاری کے عالم میں گھومتا جا رہا تھا
میرے محورِ قصاں تن کے شر سے
ہر موسم ہر منظر نظر آ رہا تھا
میں عالمِ حقیقت سے اُڑا جا رہا تھا
شاید حق درویشی کا طوق لیے
کوئی حق ادا کرنا چاہ رہا تھا

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

گیروا

کوئی تھگلی گیروے کی آسمانوں میں تن سکا تھا
کیا دھلی کی تندی سے
کوئی گیرے کو بن سکا تھا
کسی اور آشرم میں کوئی تجھ ہی سا جن سکا تھا
کوئی تھگلی گیروے کی پہناوا تو ہو سکے ہے
پس سانسیں ہیں تیرے اندر
تو جیون کو سہ سکے ہے
اور دھلی سے گیروے میں
دنیا کو کہہ سکے ہے
جیون تیاگ کر کے جانا تو پار ہے ہی
مانا کہ تجھ کو مرتو سے پیار ہے ہی
ذرا دھیرج سے سوچ لینا
بالک ہے کام تیرا
تھولے میں جو جلے تھے
کیا شعلے وہ گیروے تھے؟

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

نہ جانے کس سمت کھو گئی ہے!

(رُخسانہ نور کی نذر)

نہ جانے کس سمت کھو گئی ہے
وہ میری سوچوں کی ٹہنیوں پر
مہکنے والی
بہار موسم میں وہ چڑیا
چہکنے والی
بڑی خوشی سے
ان کہے راستوں کی تیرہ نصیبوں میں
بکھر گئی ہے
ہماری بے جان دسترس کی حدوں سے باہر
وہ موت کی بے چراغ بستی کی گھاٹیوں میں
اُتر گئی ہے

خالق آرزو/اکمالیہ

قلم ہاتھ میں تھامے
سوچوں کو لفظوں میں
ڈھالنے کی
سعی کرتی ہوں
احساس من میں اُبھرتا ہے
کہ

جھوٹ اور سچ کی
ملاوٹ میں
سچ کو دبا دیا جاتا ہے
سچ آنسو بہاتا ہے
جھوٹ سامنے کھڑا
قہقہہ لگاتا ہے
مجھے جھوٹے قہقہے نہیں پسند
مجھے آنسو ہی بھاتے ہیں
سچ کہتی ہوں
سچ لکھتی ہوں
اسی لیے تنہا اکیلی ہوں

ریما نور رضوان

اُلجھن

مجھے یاد ہے
وہ اکثر مجھ سے کہتا تھا
جاناں......!
تم ہو میرا سکون
میری ہنسی کی وجہ ہو تم
تم میری زندگی ہو
اور میں آج یہ سوچتی ہوں
فاصلے صدیوں کے ہیں ہمارے بیچ
اب وہ کیسے سکوں سے رہتا ہوگا؟
کس کے سنگ وہ ہنستا ہوگا؟
اس کی ہنسی کی وجہ بھی کوئی بنتا ہوگا؟
کیا اب بھی وہ زندگی جیتا ہوگا؟
یا یہی سب باتیں اب
کسی اور سے کہتا ہوگا؟

نوشین اقبال نوشی/کھاریاں

آپ بیتی

مرشدی عطاء الحق قاسمی

تنویر ظہور/ لاہور

مرشدی کے معنی میرا پیر ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے عطاء الحق قاسمی کو "مرشدی" کیوں لکھا ہے جبکہ آج تک میں نے ان سے کبھی کوئی ہدایت، حکمت و بصیرت حاصل نہیں کی۔ نہ انہوں نے آج تک مجھے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے عملی تدابیر اور راستے کے خطرات اور نقصانات سے بچنے کے سامان سے آگاہ کیا۔ رُشد سے مراد تو یہی ہے۔

عطاء الحق قاسمی سے جب بھی آمنا سامنا ہو تو میں باآوازِ بلند "مرشدی" کہتا ہوں۔ جواب میں وہ آہستہ سے "شیرِ پنجاب" کہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو صحیح معنوں میں "شیر" بھی وہی ہیں کہ ان کی ہمدردیاں شیروں کی جماعت سے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کا اور میرا یہ قلبی تعلق ہے۔ بیعت نہ ہونے کی باوجود میں انہیں مرشد سمجھتا ہوں۔ ذاتی طور پر میں پیری مریدی کا قائل نہیں۔ بعض احباب مجھے "پیر جی" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ جب میں نے کوئی "پیری" والا کارنامہ" کر کے نہیں دکھایا، انہوں نے مجھے پیر کہنا بند کر دیا۔

فکری طور پر میں مولانا غلام مرشد اور غلام احمد پرویز کی فکر سے متفق ہوں۔ ان دونوں حضرات کے درسِ قرآن میں سالہا سال تک شرکت کی۔ مولانا غلام مرشد، احمد ندیم قاسمی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ ندیم قاسمی صاحب کا کہنا تھا کہ "مولانا غلام مرشد صحیح معنوں میں آزاد خیال مولوی تھے۔ ملائیت والی بات ان میں نہیں تھی۔ وہ پیر پرستی اور توہم پرستی کے مخالف تھے۔ غریب انسان مانگ مانگ کر پیسے پیر صاحب کی خدمت میں نذرانہ پیش کریں، یہ بڑی زیادتی ہے۔ اس لیے میں پیری کے سلسلے کے خلاف ہوں۔"

لاکھوں مداحوں کی طرح میں بھی عطاء الحق قاسمی کے کالموں کا ادنیٰ، قاری اور مداح ہوں۔ میرا بھی یہ ماننا ہے کہ اس وقت فکاہیہ کالم نگاری میں سب سے بڑا نام عطاء الحق قاسمی کا ہے۔ فکاہت ان کے کالموں ہی میں نہیں بلکہ گفتگو میں بھی ہے۔ فی زمانہ جبکہ تقریباً ہر شخص کسی نہ کسی دُکھ، پریشانی اور روگ میں مبتلا ہے، ان حالات میں عطاء الحق قاسمی کے کالم اور تحریریں نعمت سے کم نہیں۔ جب لوگ نامور ہو جاتے ہیں تو وہ بچپن کی شرارتیں بھول جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی "نامور" ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ انہوں نے بچپن کی شرارتوں کو فراموش نہیں کیا۔ وہ اپنی تحریروں اور کالموں میں اکثر اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں کہ کن حالات سے گزر کر یہ مقام حاصل کیا۔ اصل عظمت یہی ہے۔ اسی لیے وہ میرے مرشد ہیں۔

عطاء الحق قاسمی نے مجھ سے اپنے بچپن کی ایک شرارت کا ذکر کیا۔ ان کی زبانی "مجھے اپنے بچپن کی جو ایک شرارت یاد ہے اور اس کا جو خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑا تھا وہ کچھ یوں ہے کہ ایک دن میں، مسیح، منور اور فیقا (رفیق) ہم سب وزیر آباد سے ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر کرم آباد میں مولانا ظفر علی خاں کے مزار پر واقع درخت سے بیر توڑنے جا رہے تھے۔ ہم چاروں "پہیہ" چلاتے ہوئے کرم آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ جب ہم شہر سے دور نکل آئے تو ہم میں سے کسی ایک بچے نے یہ تجویز پیش کی کہ اب جو لاری ہمارے قریب سے گزرے گی اس پر ہم پتھر پھینکیں گے۔ چنانچہ ہم نے ایک جگہ پر جا کر اپنے پہیے روکے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے ہاتھوں میں پتھر پکڑ لیے اور کسی بس کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں دور سے ایک مسافر بس قریب آتی نظر آئی۔ جونہی ہمارے سامنے سے گزری تو ہم چاروں بچوں نے بیک وقت اس پر پتھروں کی بارش کر دی۔ ہمارا خیال تھا کہ ڈرائیور ہماری اس حرکت کا نوٹس نہیں لے گا اور اپنا سفر جاری رکھے گا مگر اس نے تھوڑی دور جا کر بریک لگا دی اور جب بس رُکی تو اس میں سے ڈرائیور اور تمام مسافر نکل کر ہمیں پکڑنے کے لیے ہماری طرف دوڑے۔ ہم نے دوڑ لگا دی لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمیں آن دبوچا اور میرے سوا تمام بچوں کی اچھی خاصی پٹائی کی۔ میں اس طرح بچ گیا کہ جب یہ مسافر ہماری طرف آئے تو ان میں سے ایک مسافر نے سب سے پہلے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور کہا کہ تم مولانا بہاء الحق کے بیٹے ہو۔ میں اُن سے تمہاری شکایت کروں گا۔ سو اگرچہ میں یہاں پٹائی سے بچ گیا لیکن جو پٹائی اباجی نے کی، ان چاروں کی مجموعی پٹائی کے برابر تھی۔"

عطاء الحق قاسمی توازن آشنا ہیں کہ نہ وہ رجعت پسند اور نہ مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ حالانکہ مغرب میں ان کا کافی وقت گزرا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ توازن خون میں والدہ کی طرف سے شامل تھا کہ بچے کی شخصیت کی تعمیر میں ماں کا حصہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اپنے والد ماجد کو سمجھتے ہیں جو ان کی پہچان بنا۔ ان کا کہنا ہے کہ "زندگی کے مختلف حصوں میں، میں نے اپنے والد ماجد کی شخصیت کو اپنے لیے ایک پناہ اور سپر کے طور پر محسوس کیا۔"

عطاء الحق قاسمی کے والد ماجد کی نماز جنازہ پڑھنے کا مجھے بھی اعزاز حاصل ہوا۔ وہ ٹاٹوں والے سکول میں پڑھنے کے باوجود علم ومنصب کی بلند ترین سطح پر فائز ہیں۔

ابتداء میں، میں نے لکھا کہ عطاء الحق قاسمی مجھے ''شیر پنجاب'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ مجھے پنجابی زبان وادب کا سیوک (سیوا کرنے والا) سمجھتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی مجھے اس لیے بھی پیارے ہیں کہ وہ اپنے کالموں اور تحریروں میں پنجابی زبان کا ''تڑکا'' بھی لگاتے ہیں اور یہ ''تڑکا'' بالکل ''اوپرا'' نہیں لگتا۔ ان کے نزدیک جس زبان نے باقی رہنا ہے وہ ''اردوئے معلیٰ'' نہیں۔ ''اردوئے کلاں'' ہے۔ ان کے نزدیک دوسری پاکستانی زبانوں کو مکمل طور پر نظر انداز کرنے کے عمل نے پاکستان کو فائدہ نہیں نقصان پہنچایا ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ دوسری پاکستانی زبانوں کو بھی ان کا حق فوری طور پر ملنا چاہیے، اگر ہم نے اس عمل میں دیر کی تو اس کا خوفناک خمیازہ ملک وقوم کو بھگتنا ہوگا۔

عطاء الحق قاسمی ریڈیو پاکستان لاہور کے لیے پنجابی میں کالم لکھتے رہے ہیں۔ پنجابی شاعری بھی کی۔ ایک دو سفرنامے اور چند تنقیدی مضامین پنجابی میں لکھے۔ اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ مادری زبان کا پہلا اور آخری عشق ہے۔

عطاء الحق قاسمی کا شعر ہے:

تتلیاں ہجرت کریں گی موسموں کے ساتھ ساتھ
اور شہر گل میں آشوب ہوا رہ جائے گا

وہ شہر گل کو فتنہ وفساد، بلووں، طوفانوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی اب ماشاء اللہ کئی کاروں اور کروڑوں روپے کی جائیداد کے مالک ہیں۔ جب وہ علامہ اقبال ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے تو ان کے قریب ہی قیوم اعتصامی کا مکان ہے۔ قیوم اعتصامی صاحب کچھ عرصہ روزنامہ ''جنگ'' لاہور کے میگزین ایڈیٹر رہے ہیں۔ اس دوران میں مجھے ان کی ماتحتی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک روز اعتصامی صاحب نے مجھے بتایا کہ عطاء الحق قاسمی نے کار (سیکنڈ ہینڈ) خریدی ہے۔ وہ اپنی کار میں میرے گھر آیا اور مجھ سے کہا ''اعتصامی صاحب! میری کار میں بیٹھو، میں آپ کو ''جھونٹا'' (ہلارا، کار میں سوار ہونے کی خوشی) دلا کے لاتا ہوں۔'' اعتصامی صاحب! اپنی اس خوشی میں انہوں نے اپنے دوست اور محلے دار قیوم اعتصامی کو بھی شامل کیا۔

عطاء الحق قاسمی اردو زبان وادب کے ایک معتبر شاعر، ادیب، کالم نگار، مثالی نثر نگار ہیں۔ انہوں نے بعض ٹی وی ڈرامے لکھ کر بھی بہت شہرت اور ناموری حاصل کی۔ عام قارئین عطاء الحق قاسمی کی محض کالم نویسی ہی سے انہیں جانتے پہچانتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی کالم نگاری کی متعدد، جہتیں اور سمتیں ہیں۔ یعنی ان کے کالم صرف ہلکے پھلکے، خوشگوار اور دلچسپ ہی نہیں ہوتے بلکہ ان میں علم وادب، عروض وگریمر، نثری قواعد وضوابط، لسانی نزاکتیں، فکر ونظر کی توانائیاں اور اسلوب وبیان کی شوخیاں اور خوش آرائیاں بھی ہوتی ہیں۔ عطاء کا ہر کالم چاہے کسی بھی موضوع پر ہو مقصدیت بردار ہوتا ہے۔ ہر کالم اگرچہ عوامی رنگ وآہنگ اور لفظیاتی حسن واوصاف سے مرصع ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کالموں کی بہر حال مستقل ادبی حیثیت اور اہمیت ہوتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کو دوسری زبانوں کے تڑکے کے ساتھ نئے لفظ اور تراکیب وضع کرنے میں بے پناہ ملکہ حاصل ہے۔ اس اعتبار سے ان کا ہر کالم کثیر پہلو خوبیوں، اوصاف اور رومانی نزاکتوں کے باوصف خوشگوار بھی ہوتا ہے۔ کالموں میں برجستہ اور برمحل جملے، نئی تراکیب وضع کرنے اور بے ساختگی کے ساتھ استعمال کرنے میں عطاء الحق قاسمی سب سے ممتاز اور منفرد ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کے چند کالم میرے پاس ''بطور تبرک'' محفوظ ہیں۔

۱۲ اپریل ۱۹۹۰ء کو روزنامہ ''نوائے وقت'' میں عطاء الحق قاسمی کا کالم بعنوان ''ایک تصویر کی کہانی'' شائع ہوا۔ یہ میرے ایک ایسے دوست کے بارے میں تھا جنہوں نے پنجابی کے علاوہ انگریزی اور اردو میں بھی لکھا لیکن ان کا زیادہ کام پنجابی زبان وادب کی ترقی وترویج ہے۔ کالم کے آخری جملے یہ تھے: ''تمہیں یہ تصویر کیسی لگی؟ بہت اچھی، مگر اس تصویر کے پیچھے ایک اور تصویر فریم میں آویزاں ہے، وہ زیادہ معنی خیز ہے۔ کونسی تصویر؟ یار تمہاری بینائی کو کیا ہو گیا، جو جس میں ایک ماں بچے کو فیڈر سے دودھ پلا رہی ہے! یہ تصویر بہت سمبالک ہے۔''

اس میں سمبالک والی کونسی بات ہے؟

''یہی کہ بہت سے سیاسی رہنماؤں کے منہ سے، بالغ ہونے کے بعد بھی دودھ کی مہک آتی ہے مگر یہ مہک ماں کے دودھ کی نہیں، امپورٹڈ دودھ کی ہوتی ہے۔ اب یہ سیاسی پارٹیوں کا کام ہے کہ وہ خود اپنے کارکنوں کے فیڈر چیک کریں تا کہ پتہ تو چل سکے کہ کسے، کون فیڈ کر رہا ہے اور کیا فیڈ کر رہا ہے؟''

عطاء صاحب کا ''نوائے وقت'' میں ۲۰ جون ۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والا کالم ''شریف بنجارے کے لیے حرف سپاس!'' کا اقتباس پیش ہے ''شریف بنجارہ شاعر ہے اور پاک ٹی ہاؤس لاہور کا باورچی اور بیرا ہے۔ جہاں روزانہ شام کو ادیبوں کی بیٹھک ہوتی ہے۔ شریف بنجارہ کے بارے میں گفتگو تو بعد میں کروں گا، پہلے میں ''سانجھاں'' کے توسط سے تنویر ظہور کو اس امر مبارک دے لوں کہ اس نے اسی شریف بنجارے کے اعزاز میں خصوصی محفل منعقد کی۔''

کالم کی آخری سطریں یہ تھیں: ''میں نہیں جانتا جب حرص وہوا سے مرا، اپنے خیالوں میں تم، محبت

کے خواب دیکھنے والا شریف ،بنجارہ رات کو اپنے گھر میں داخل ہوتا ہوگا تو اس کی بیوی اور بچے اس کا استقبال کس طرح کرتے ہوں گے۔ وہ اس کی جیبیں ٹٹولتے ہوں گے یا اس کی دل کی دھڑکن سنتے ہوں گے؟ ظاہر ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ شریف بنجارہ تو اپنے ایمان کی روشنی سے قہوہ خانے کی میلی میلی فضا کو بھی اجلا اجلا کر دیتا ہے۔ سو مجھے یقین ہے کہ جب وہ اپنے بجھے بجھے گھر میں داخل ہوا ہوگا تو اس کے در و دیوار بھی روشن روشن نظر آتے ہوں گے!

۱۹ اپریل ۱۹۷۳ء کو "نوائے وقت" ہی میں ان کا کالم "وائی ایم سی اے کی نئی راودھا اور تو من تیل والی شرط!" شائع ہوا۔ کالم کا کچھ حصہ پیش ہے "جس طرح قصور وہاں کی میتھی جناب احمد رضا قصوری کی وجہ سے مشہور ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ وائی ایم سی اے سے حلقہ ارباب ذوق کی بدولت متعارف ہیں جس کے ہفتہ وار اجلاس سالہا سال سے وہاں منعقد ہوتے چلے آرہے ہیں سوائے گزشتہ اتوار کے اجلاس کے جو صحن میں منعقد ہوا۔ سامعین کو کرسیوں کے بجائے چارپائیوں اور موڑھوں پر بٹھایا گیا۔ اس کی وجہ وائی ایم سی اے کی انتظامیہ کی طرف سے پیش کردہ وہ نئی شرائط ہیں جو انہوں نے حال ہی میں حلقہ والوں کو پیش کی ہیں۔ جن کے پورا ہونے تک حلقے کا اجلاس نہ ہو سکے گا۔ ان میں ایک شرط یہ ہے کہ کمرے کا کرایہ ڈیڑھ سو روپے سالانہ کے بجائے سات سو روپے سالانہ ہوگا اور پیشگی ادا کرنا ہوگا۔

یہ پابندیاں صرف حلقہ ارباب ذوق ہی پر عائد نہیں کی گئیں بلکہ پنجابی ادبی سنگت کے ساتھ بھی اس ضمن میں برابر کا سلوک کیا گیا ہے جس کا اجلاس اس عمارت کے دوسرے کمرے میں منعقد ہوتا ہے۔ حلقہ والوں نے تو کمرے کے بالمقابل واقع صحن میں اجلاس منعقد کر لیا مگر سنگت کے تنویر ظہور نے اپنے اجلاس کے لیے وائی ایم سی اے کے ریستوران کو منتخب کیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ بعد میں چائے کا آرڈر بھی دیا جائے گا چنانچہ ایسا کیا گیا۔ توقع تھی کہ لائل پور سے قومی اسمبلی کے رکن اور پنجابی کے ممتاز شاعر جناب افضل احسن رندھاوا جو اس اجلاس میں شریک تھے، اپنی جیب خاص سے بل کی ادائیگی کر دیں گے، مگر موقع آنے پر چراغ رخ زیبا سے ڈھونڈنے کے باوجود وہ کہیں نظر نہ آئے۔ دروغ برگردن راوی، شنید ہے کہ یہ بل ادا نہ کیے جانے کے باعث ریستوران والوں نے اس اجلاس میں پڑھی جانے والی نظمیں، غزلیں اور مضامین بلکہ بعض شاعروں کی بیاضیں تک بطور یرغمال بنا کر قبضے میں لے لی ہیں اور بے شک یہ لوگ خسارے میں ہیں"۔

آپ سوچ رہے ہوں گے، میں نے صرف "نوائے وقت" میں شائع شدہ کلام ہی سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ روزنامہ جنگ میں ۱۲ اگست ۲۰۰۲ء کو عطاء الحق قاسمی کا جو کالم شائع ہوا اس کا عنوان ہے "تین مہینوں میں دو پنجابی کانفرنسیں" انہوں نے لکھا "اسے حسن اتفاق ہی قرار دیا جا سکتا ہے کہ برطانیہ میں چند ماہ کے دوران دو پنجابی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ایک پنجابی کانفرنس تو ہمدم دیرینہ فخر زمان کی طرف سے تھی جس کی باگیں انہوں نے لندن میں مقیم شاعروں کی جوڑی یعنی امین ملک اور ان کی اہلیہ رانی ملک کے ہاتھوں میں تھما دی تھی۔ کانفرنس کے دوران امین ملک کو لاہور کے ایک پنجابی شاعر کے سکھداحوں نے اپنے ممدوح کے ساتھ مبینہ بدسلوکی پر بری طرح پیٹا جبکہ وہ خود تو موقع سے فرار ہو گئے۔ ہمارے یہ پنجابی شاعر برطانوی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے اور انہیں ایک دن حالات میں رہنا پڑا۔ اسی طرح ایک پاکستانی پنجابی دانشور اپنی جھولی پھیلا پھیلا کر بھارتی سکھوں سے مدد کی درخواست کرتا رہا اور یہ کہتا رہا کہ "لاہور کے دانشور" کی "حسن گھیریوں" کے اور بھی بہت سے قصے لندن کے پاکستانیوں کی زبان پر ہیں۔

فخر زمان کی اس کانفرنس میں کانگریسی سکھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ برطانیہ کے شہر روچڈیل میں منعقد ہونے والی دوسری عالمی پنجابی کانفرنس کے منتظم اعلیٰ صابر رضا کی تعلق بھی پیپلز پارٹی سے ہے۔ لگتا ہے انہوں نے یہ کانفرنس پارٹی کی پاکستانیت کے دامن سے لندن کی کانفرنس کا داغ دھونے کے لیے منعقد کی تھی کیونکہ صابر رضا سمیت پنجابی کے جتنے دانشوروں نے تقریریں کیں ان کا لب لباب یہی تھا کہ ہم پہلے پاکستانی اور پھر پنجابی ہیں۔ ان دونوں کی لڑائی میں فائدہ صرف انگریزی کا ہوگا اور بیوروکریسی یہی چاہتی ہے۔

راقم الحروف نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا تھا" کہ میں کسی بھی زبان کی نسبت اپنی مادری زبان پنجابی میں گفتگو کرتے ہوئے خود کو زیادہ آسانی میں محسوس کرتا ہوں لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں پنجابی سے محبت کی بنا پر امرتسر کے رام لعل کو کراچی کے عبدالستار پر ترجیح دوں۔ میرے نزدیک صرف زبان نہیں، مذہب اور کچھ بھی اہم ہیں، ان سے تعمیر ہی کا کام لینا چاہیے۔ تخریب کا نہیں۔ میں نے اس موقع پر یہ تجویز بھی پیش کی کہ پنجابی کے فروغ کے لیے پنجابی کے دونوں دھڑے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوں اور یہ پلیٹ فارم سیاسی اغراض سے بالکل پاک ہو۔ پنجابی کے دونوں دھڑے اگر صرف ایک نکتے یعنی پنجابی زبان و ادب کے فروغ پر یکجا ہو جائیں تو اس سے پنجاب کے محب وطن عوام کے وہ خدشات دور ہو جائیں گے جو زبان کو سیاسی اغراض کے لیے استعمال کرنے کی وجہ سے ان کے دلوں میں پائے جاتے ہیں۔

اُردو ادب کے فروغ اور ترویج کے لیے جو ادبی تنظیمیں ملکی اور عالمی سطح پر کام کر رہی ہیں ماہنامہ ''ارژنگ'' نے اُن کے اور اُن کے عہدیداران آنؔ ادیبوں کے تعارف کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ مسقط (عمان) سے ہمیں عابد جاوید مغل نے سوشل کلب آف عمان کے چند عہدیداروں کا تعارف و کلام ارسال کیا ہے جو نذر قارئین ہے۔

ناصر معروف

عہد تدبیر میں جس طرح ہیرے کو ایک جوہری ہی تراش سکتا ہے اس طرح شاعری ایک ایسا ہنر ہے جس کے لیے محض چند لوگ ہی مختص ہوتے ہیں۔ گزشتہ بارہ برس سے عمان میں مقیم نہایت شفیق کاروباری اور ادبی شخصیت جناب ناصر معروف پاکستان اور عمان سمیت مختلف ممالک کے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ دیار غیر میں رہتے ہوئے ہزار سماجی مسائل اور دیگر ذمہ داریوں کا بوجھ سر لیے ہوئے بھی ناصر معروف نے خود کو لمحہ بھر کے لیے بھی اپنی ثقافت اور وطن سے اظہار اُلفت کے لیے پست نہیں کیا۔ مجلس شعر و ادب پاکستان سوشل کلب عمان میں ناصر معروف کا کردار ایک نمایاں مثال ہے اور وہ گزشتہ چھ سال کے مختلف ادوار میں جائنٹ سیکرٹری اور ڈپٹی ہیڈ کے طور پر سوشل کلب آف عمان کے فرائض بھاتے آئے ہیں اور موجودہ صدر مجلس شعر و ادب کے طور پر اپنی انتھک خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ بلاشبہ ناصر معروف کا شمار عمان میں ادب کی دنیا میں کردار ساز شخصیات میں ہوتا ہے کہ انہوں نے اہل ذوق کی تسکین اور ادب سے شغف رکھنے والوں کے لیے مسقط کی سرزمین پر اپنے جان و مال اور آرام کی پروا نہ کرتے ہوئے بھی خوبصورت تقاریب کا اہتمام کیا اور اُردو ادب کی ترویج اور فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ناصر معروف ایک عمدہ مزاج شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نثر نگار بھی ہیں۔ اُن کا وجود اس وقت سوشل کلب عمان اور مسقط کی سرزمین میں فروغ ادب کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔

منتخب کلام

انسانوں کا کھوج لگانا پڑتا ہے
اپنے منہ پر ماس چڑھانا پڑتا ہے
نیلے پیلے لال گلابی رنگوں میں
درویشی کا رنگ ملانا پڑتا ہے
پچھلے دور میں دشمن دور سے آتے تھے
اب اپنوں سے کام چلانا پڑتا ہے
تیرے بچے سیر سپاٹا کرتے ہیں
کچھ بچوں کو رزق کمانا پڑتا ہے
فرقت کی وحشت سے بچنے کی خاطر
غم کو بھی یار بنانا پڑتا ہے
روز بلائیں یادوں کی آ جاتی ہیں
اُن کو اپنا خون پلانا پڑتا ہے
ناصر دین سے رغبت رکھنے والوں کو
اک دن اپنا سر کٹوانا پڑتا ہے

....

بات پرانی چھوڑو، چھوڑو جانے دو
ماضی کو نہ پکڑو چھوڑو جانے دو
کاروبار میں گھاٹے بھی ہو جاتے ہیں
قسمت کو نہ کوسو چھوڑو جانے دو
بات بات پہ رونا دھونا ٹھیک نہیں ہوتا
میرے دل کی مانو چھوڑو جانے دو
دیکھو پاگل جو گزرا سو ہو گزرا
مستقبل کی سوچو چھوڑو جانے دو
دل کو اتنا روگ لگانا ٹھیک نہیں
اتنا بھی نہ سوچو چھوڑو جانے دو
عشق محبت تیرے بس کی بات نہیں
سیدھا گھر کو جاؤ چھوڑو جانے دو
دنیا داری مال و دولت فانی ہیں
ناصر مٹی ڈالو چھوڑو جانے دو

مقبول احمد شیخ

گلستانِ شعر و ادب کو بے شمار گل ہائے نایاب نے اپنی خوشبوؤں اور بے نظیر بناوٹ اور خوبصورتی سے سجا رکھا ہے لیکن دیار غیر میں جن گلاب صفت لوگوں نے اپنی شاعری اور ادبی خدمات سے اردو کی آبرو کو بحال رکھا ہے ان میں مقبول احمد شیخ کا نام نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ سلطنت عمان میں اردو کی آبیاری اور شاعری کی ترقی و ترویج میں ان کا کلیدی کردار ہے۔ مقبول احمد شیخ پاکستان سوشل کلب عمان کی مجلس شعر و ادب کے نائب ہیڈ ہونے کے ساتھ ساتھ مسقط کے ایک موقر ادارے میں ڈپٹی جنرل منیجر کے طور پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کی شاعری کے مضامین خارج سے مستعار لیے ہوئے نہیں بلکہ ان کی شاعری ان کے کھرے جذبات اور ذاتی واردات پر مبنی محسوس ہوتی ہے۔ اُردو شاعری کی شاید ہی کوئی صنف ہو جسے انہوں نے سلیقے سے نہ برتا ہو۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں قسم کی شاعری پر دسترس رکھتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شاعر دونوں طرح کی شاعری کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے عہدہ برآ ہو۔ مقبول شیخ صاف لفظوں، بلند آہنگ فقروں اور آسان زبان میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا شعر سن یا پڑھ کر لغت کھنگالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کی شاعری میں

جرات اظہار تو ہے ہی لیکن قلبی وارداتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور دلکش انداز میں موجود ہے۔ شعر پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہے اور شعر تمام نزاکتوں کے ساتھ کہنا جانتے ہیں۔ ان کے افکار اور انداز میں استقامت ہے۔ ان کے لہجے میں اظہار کی شدت ہے جو بعض اوقات سرگوشی کو بھی نعرۂ مستانہ بنا دیتی ہے۔ ان کے شعر سن کر ذہن کے تاروں میں ہلچل برپا ہونا فطری عمل ہے۔ ان کی مناسب شاعری میں سادگی کے ساتھ جو بے ساختہ پن ہے وہ ان کو اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں نمایاں مقام کا تقاضہ کرتا ہے۔ ذیل میں ان کے سنجیدہ اور مزاحیہ قطعات پیش کیے جاتے ہیں۔

منتخب کلام

بعد از ترکِ تعلق میری وحشت کی قسم
تیری ہر یاد کو پرزوں میں اڑایا میں نے
انتقاماً تیری تصویر کے ٹکڑے تو کیے
احتراماً انہیں پلکوں سے اٹھایا میں نے

....

دیکھ کر دولہا کے تیور حق مہر کے باب میں
ساس بولی اے میاں دو لاکھ کی کیا بات ہے
ہاتھ جوڑے لی اجازت اور دولہا نے کہا
"چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے"

....

دولہا سے مولوی نے کہا یہ نکاح کے بغیر
بیوی ہے یہ کہ آپ پہلوان لے چلے
اک آہ سرد کھینچ کے دولہا نے یہ کہا
"ہم آج اپنی موت کا سامان لے چلے"

موسیٰ کشمیری

ایک ایسا لمحہ جو آشتی کا پیام رساں ہے۔ ایک ایسی خوشبو جو منصب یقین سے منسوب ہے ایک ایسا عنوان جو مانوس خیال سے لبریز ہے۔ کچھ انہی حقائق پر مبنی موسیٰ کشمیری سرزمین عمان کی دھوپ میں روئیدہ سرسبز شجر کی مانند ہے جس کی گھنی چھاؤں میں استراحت اور شاعری کی رم جھم واضح نظر آ رہی ہیں۔ پاکستان ضلع گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں وزیر کے چٹھہ کے کشمیر قبیلہ سے تعلق رکھنے والا یہ شخص گزشتہ پانچ سال سے روزگار کے سلسلہ میں عمان میں مقیم ہے۔ موسیٰ کشمیری عمان میں ایک نجی کمپنی میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان سوشل کلب عمان کے ونگ مجلس شعر و ادب میں جنرل سیکرٹری کے فرائض نبھا رہے ہیں۔

ادب کی دنیا میں جہاں متعدد قلم کاروں نے اپنے وطن سے دور رہ کر بھی اپنی زبان اور ثقافت سے محبت کا سلسلہ برقرار رکھا ہے وہاں موسیٰ کشمیری نے بھی دیار غیر میں رہتے ہوئے شاعری کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا اور وہ مسقط میں وقتاً فوقتاً مجلس شعر و ادب پاکستان سوشل کلب کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تمام تقاریب میں اپنی ادبی اور فنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ موسیٰ کشمیری ایک منفرد لہجے کا شاعر ہے۔ مسقط عمان میں اس کی پرسوز غزلوں اور نفیس لہجے کو ایک خاص اہمیت دی جاتی ہے اور اسے مسقط کا نگینہ شاعر کہا جاتا ہے۔ موسیٰ کشمیری کی معرفت پر مبنی شاعری میں ایک خاص لذت ہے جو دل کے تار چھیڑ دیتی ہے۔

قلمی نام میں موسیٰ کشمیری سے پکارے جانے والے اس شاعر کا اصلی نام محمد عثمان بن محمد اسلم بٹ ہے۔ موسیٰ کشمیری کا پہلا مجموعہ کلام جو کہ 2011 میں شائع ہوا، سے چند اشعار درج ذیل ہیں:

نوک نیزہ پہ بھی کرتے ہیں جو سچی باتیں
بس وہی صاحب قرآن ہوا کرتے ہیں

....

خدا کی ذات پہ مندر بھی ایک حجت ہے
نہیں شعور تو مسجد میں بھی ہیں لات و منات

....

شکستہ پن معمول زندگی میں خوئے پستی ہے
ذرا سوچیں تو خود اپنے لیے دیوار ہے بندہ

....

پاؤ جو موت ایسی کہ دشمن بھی رو پڑے
زندہ رہو تو بن کے رقیبوں کے پاسدار

ارشد نذیر ساحل/ بارسلونا (اسپین)

اس بات پہ دل برسوں پریشان رہا ہے
کیا اس کا کبھی میری طرف دھیان رہا ہے

جتنا میں نظر آتا ہوں خاموش بظاہر
اندر مرے اتنا کوئی طوفان رہا ہے

موسم کی طرح کیسے بدل جاتے ہیں سب لوگ
اس بات پہ دل میرا تو حیران رہا ہے

جنگل کا رہا ہے یہاں قانون ہمیشہ
شہروں میں درندے تھے کہ انسان رہا ہے

میں جس کے لیے عمر گنوا آیا ہوں اپنی
وہ تو مجھے مشکل سے ہی پہچان رہا ہے

ساحل میں سمندر کا کبھی ہوتا تھا حصہ
کچھ دن تو مرا چاند بھی مہمان رہا ہے

مختصر ادبی خبریں/تقریبات

ڈاکٹر ناہید شاہد کی وفات

اورینٹل کالج کے ہر دل عزیز پروفیسر ڈاکٹر ناہید شاہد طویل علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ ادارہ ''ارژنگ'' اہل خانہ کے غم میں برابر کا شریک اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

وفات حسین شاد

پنجابی ادب کے معروف شاعر، کہانی کار، ڈرامہ نگار جن کا نام ریڈیو، ٹی وی کے اچھے کہانی و ڈراما نگاروں میں شمار ہوتا تھا۔ قضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں۔

ادارہ ''ارژنگ'' اہل خانہ کے غم میں برابر شریک ہے اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔

وحید قندیل کے اعزاز میں تقریب

پہچان انٹرنیشنل کے زیر اہتمام آسٹریلیا سے تشریف لائے ہوئے معروف شاعر اور سفرنامہ نگار وحید قندیل کے اعزاز میں اکیڈمی ادبیات پاکستان کے لاہور دفتر میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت نامور شاعرہ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق نے کی۔ مہمان خصوصی ممتاز ادیب ممتاز راشد لاہوری تھے۔ جبکہ مہمانان اعزاز میں انیس احمد اور افتخار شوکت چوہدری تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ایم ابرار نے ادا کیے۔ ابتدا حمد اور نعت سے ہوئی۔ محمد جمیل اور تقریب کے میزبان حسن عباسی نے تمام شعراء اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنا کلام سنایا جن شعراء نے اس تقریب میں اپنا کلام سنایا ان میں محمد جمیل، وحید قندیل، حسن عباسی، ڈاکٹر ایم ابرار، ڈاکٹر عمرانہ مشتاق، محمد ممتاز راشد لاہوری، انیس احمد، افتخار شوکت چوہدری، اسلام عظمی، عذرا مرزا، یاسمین بخاری، فراست بخاری، نیازت علی نیاز، زاہد محمود شمس، وحید ناز، اسد باقی کے اسمائے گرامی شامل ہیں صاحب شام وحید قندیل نے اپنی خوبصورت شاعری اور شگفتہ گفتگو سے محفل لوٹ لی۔ اس موقع پر انہوں نے سال ہی میں شائع ہونے والا اپنا سفرنامہ تھائی لینڈ بھی شرکاء کو پیش کیا۔ تقریب کے بعد ضیافت کا اہتمام تھا۔

احباب فاؤنڈیشن لاہور کی شام غزل

احباب فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 16 نومبر 2016ء کو الحمرا ادبی بیٹھک میں ایک شام غزل ہوئی جس میں سینئر گلوکار ارشد علی نے ڈیڑھ گھنٹے تک کئی غزلیں اور نغمے پیش کیے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر خالد سعید اور غیاث حیدر نے بھی غزلیں سنائیں۔ نظامت کے فرائض عزیزے شیخ نے ادا کیے۔ نمایاں شرکاء تھے کیپٹن (ر) عطا محمد خاں، ممتاز راشد لاہوری، اعجاز فیروز اعجاز، افضل ساحر، ڈاکٹر افتخار بخاری، افضال عاجز، آفتاب خاں، فاطمہ غزل، پروین وفا ہاشمی، صفیہ اسحاق، چوہدری ندیم گجر، اشتیاق مرزا، ریاض احمد جٹس، گلوکار سہیل، ڈرامہ ہدایت کار منیر راج، زوار احمد طارق اور دیگر تھے۔

میواتی دنیا کا مشاعرہ

لاہور کی فعال ادبی تنظیم میواتی دنیا کا ماہانہ مشاعرہ 22 نومبر 2016ء کو ''پلاک'' نزد قذافی سٹیڈیم لاہور میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت 23 کتب کے خالق اور مدیر اعلیٰ خیال و فن ممتاز راشد لاہوری نے کی۔ مہمان خصوصی توقیر احمد شریفی اور مہمان اعزاز عثمان محمود تھے۔ نظامت کے فرائض میزبان تنظیم کے روح رواں اور سینئر شاعر ریاض رومانی نے ادا کیے۔ اس مشاعرے میں بیس سے زائد شعراو شاعرات نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ ان میں صدر مشاعرہ ممتاز راشد لاہوری، مہمانان خاص توقیر احمد شریفی اور عثمان محمود نیز ناظم مشاعرہ ریاض رومانی کے علاوہ یہ نام تھے: حسین مجروح، طارق داجلی، سردار سوز (امریکہ)، سعید عاصم، عدل منہاس لاہوری، اسلم شوق، ڈاکٹر طاہر شبیر میو، سعید محمد سعید، اشفاق فلک، عذرا مرزا، شفیق عطاری، پروین وفا ہاشمی، اسد اللہ ارشد میو، خاطر تونسوی اور علی رضا رضی۔

کارروائیاں

اردو، پنجابی ادبی سانجھ کا ماہانہ نعتیہ مشاعرہ ناصر باغ چوپال لاہور میں منعقد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر عاشق رحیل نے کی۔ جبکہ مہمانان گرامی میں عدل منہاس لاہوری اور ہمایوں پرویز شاہد تھے۔ نظامت کے فرائض عقیل شافی نے خوبصورت انداز میں نبھائے جن شعراء کرام نے آقائے ہر دو عالم کے حضور عقیدت کے پھول نچھاور کیے ان میں شاہد عباسی، خالد محمود آشفتہ، مجیر

ڈاکٹر ایم ابرار، اویس گلزار، ساجد ڈھلوں، پروفیسر ظہیر احمد ظہیر، محمد زاہد شامل تھے۔

بزمِ عاقل لاہور کا ماہانہ مشاعرہ ناصر باغ چوپال میں سرکارِ مدینہ کی ولادت باسعادت کی خوشی کے موقع پر نعتیہ مشاعرہ ہوا۔ جس کی صدارت چودھری کرم علی کیلی (پاکپتن) نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں عمران سلیم، ہیرا جی، ناز اوکاڑوی، علمدار حیدر اوج تھے۔ سٹیج سیکرٹری عقیل شافی نے بڑے خوبصورت لہجے میں نعتیہ مشاعرے کو سامعین کے سامنے پیش کیا۔ خوش قسمت شعراء کرام جنہوں نے حضرت محمدؐ کی بارگاہ اقدس میں حاضری کا شرف حاصل کیا۔ ان میں ساجد پریمی، ساجد ڈھلوں، محبوب علی مظفر، خالد محمود آشفتہ، یحییٰ شاہد، سید فراست بخاری، ڈاکٹر ایم ابرار، مشتاق قمر، شاہد عباسی، مظفر ابن عاقل، منور ابن عاقل، محمد علی منور، ہمایوں پرویز شاہد، پروفیسر عاشق رحیل، محمد زاہد، عدل منہاس لہوری کے نام نمایاں ہیں۔

دبستان 2016 کی تعارفی تقریب

گورنمنٹ کالج آف سائنس، وحدت روڈ لاہور کے علمی و ادبی مجلہ دبستان 2016 کی تعارفی تقریب سوسائٹیز بورڈ کے زیرِ اہتمام کالج کے وسیع "جھویری ہال" میں منعقد ہوئی۔ صدارت پرنسپل پروفیسر اعزاز احمد خاں نے کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی ڈی پی آئی (کالجز) پنجاب پروفیسر جہانگیر احمد چودھری تھے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر سید شکیل عباس زیدی نے انجام دیے۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر جہانگیر احمد چودھری نے کہا کہ "دبستان" کا تازہ شمارہ محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں شامل تحریریں سچائی اور تاثیر کی قوت رکھتی ہیں۔ پروفیسر اعزاز احمد خاں نے مجلس ادارت کے جملہ ارکان بالخصوص مدیرِ اعلیٰ ڈاکٹر ایوب ندیم کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ دبستان کا یہ شمارہ کوئی تین چار سال کے تعطل کے بعد شائع ہوا ہے لیکن اس میں اساتذہ کے ساتھ ساتھ طلبہ و طالبات نے جس جذبے اور لگن کے ساتھ حصہ لیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ "دبستان" کے مدیرِ اعلیٰ ڈاکٹر ایوب ندیم نے کہا کہ "دبستان" کا موجودہ شمارہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں اول تا آخر کالج کے سابق اور موجودہ اساتذہ کے پہلو بہ پہلو طلبہ و طالبات کی نثری و شعری نگارشات بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ اس طرح تقریباً ستر نئے لکھنے والوں کو اس مجلہ کے ذریعے متعارف کرایا گیا ہے۔ تقریب سے وائس پرنسپل پروفیسر اظہار الحسن شاہ، سوسائٹیز بورڈ کے چیئرمین ڈاکٹر ممتاز احمد، پروفیسر محمد ایوب منیر اور طلبہ و طالبات کی جانب سے محمد جواد حسن نے خطاب کیا۔ آخر میں پرنسپل کی طرف سے مہمانِ خصوصی اور مدیرِ اعلیٰ کو شیلڈز، جبکہ مہمان اساتذہ و ادبا ڈاکٹر ناصر بلوچ اور پروفیسر (ر) محمد شفیق کھوکھر کو "دبستان" کے شمارے پیش کیے گئے۔

محفلِ مشاعرہ

حلقہ دارالادب اور ماہنامہ میوات کے زیرِ اہتمام ماہانہ مشاعرہ کاہنہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت ضیاء الرحمٰن فاروقی نے کی۔ مہمانِ خصوصی فہیم احمد فہیم میو تھے۔ جبکہ مہمانِ اعزاز محمد امین سندھو تھے۔ اس مشاعرہ میں ضیاء الرحمٰن فاروقی، محمد امین سندھو، اقبال پیام، ڈاکٹر پروفیسر افضل خاں راہی، اعجاز حسن اعجاز، رمضان جگر، رحمت خاں بابر، محمد زاہد، محمد حمید، فرہاد، محمد ساجد، رحمت شاکر، خالد محمود، انجم میو، الیاس امانت، نواز چشم اور دیگر نے اپنا کلام پیش کیا۔

ناصر علی سید / پشاور

صبح سویرے
آنگن میں اک روز کے آنے والی چڑیا
آج بھی وقت پہ آئی تھی
پر آج تو اس نے
دانہ پانی یا چاول کو چھوا نہیں ہے
بے چینی سے چوں چوں کرتی
ادھر اُدھر پھدکتی چڑیا
بھوکی پیاسی لوٹ گئی ہے
آج اکیلی آئی تھی وہ

دل آنکھیں اور پتھر سائیں
اب ہیں ایک برابر سائیں
باہر پھول بہت ہیں لیکن
ویرانہ ہے اندر سائیں
اک اک کر کے کٹ گئے سارے
میرے سرو صنوبر سائیں
ابرِ کرم کا کوئی چھینٹا
جھلسے ہیں سب منظر سائیں
دھوپ آندھی بارش کی زد میں
شہر میں اک میرا گھر سائیں
میرے اندر شور مچائے
چپ کا ایک سمندر سائیں

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: سفرنامہ تھائی لینڈ/مصنف: وحید قندیل/صفحات: 328/ قیمت: 600روپے/تبصرہ نگار: ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

ہر شخص کے اندر ایک سیاح ہوتا ہے نئی جگہوں پر جانا اور نئے منظروں کو دیکھنا سب کو اچھا لگتا ہے۔ سب مسافر سفر کی یادداشتیں اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر کے لاتے ہیں۔ انھیں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ شیئر کرتے ہیں لیکن ان میں معدودے چند ایسے ہوتے ہیں جو سفرنامہ لکھتے ہیں۔ اس طرح وہ قاری کو اپنا ہم سفر بنا لیتے ہیں۔ ''سفرنامہ تھائی لینڈ'' وحید قندیل کا دوسرا سفرنامہ ہے۔ تھائی لینڈ کی سرزمین گزشتہ کئی دہائیوں سے سیاحوں کے لیے پرکشش ہے۔ اس کی وجہ اس کی خوب صورتیاں ہیں۔ دل فریب ساحل، ان ساحلوں کی ریت پر ٹھنڈی چھاؤں جیسے اجسام، پرکشش جزائر، جدید ترقی کے تمام رنگ وروپ جو کہ خاص کر بین الاقوامی شہر بنکاک میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بدھ تہذیب کے مرکز تھائی لینڈ کی خوب صورتیوں کو جس طرح وحید قندیل نے اپنی لطیف نثر میں پرویا ہے اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

وحید قندیل کے اندر ایک مکمل سیاح موجود ہے اور مکمل شاعر بھی۔ وہ مناظر کو مکمل حیرت سے دیکھتے ہیں اور انکے بارے اپنا تجزیہ اور مشاہدہ شامل کر کے سفرنامہ کا حصہ بنادیتے ہیں جسے قاری پڑھ کر ویسے ہی احساس سے دوچار ہوتا ہے جو سفرنامہ نگار کے اندر منظر کو دیکھتے وقت بیدار ہوتا ہے۔ جو لوگ تھائی لینڈ کی سیاحت کرنے کے خواہش مند ہوں انھیں وحید قندیل کا سفرنامہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ ورنہ ان کا سفر ادھورا رہے گا۔ میں اگرچہ خود کئی بار بنکاک گیا ہوں مگر وحید قندیل کا سفرنامہ پڑھ کر مجھے یوں لگا کہ جیسے میں نے اب بنکاک دیکھا ہے۔ میری طرف سے وحید کے لیے ڈھیروں دعائیں اور مبارک باد۔

نام کتاب: کلیات میر ریحان/شاعر: میر ریحان/صفحات: 304/ قیمت: 600روپے/تبصرہ نگار: انجینئر خواجہ ضیاءالدین جہانگیر سید
ناشر: ادبستان دربار مارکیٹ، نزد دربار داتا صاحب لاہور

میر ریحان صاحب کا صنف شاعری کے ساتھ لگاؤ دیکھ کر بے حد مسرور ہوا۔ زیر طباعت کلام کے چند صفحات کے سرسری مطالعے سے ہی مجھے یقین کامل ہو گیا ہے کہ ہماری باذوق خواتین کو بھی کلیات میر ریحان کے اشعار اتنے ہی پسند آئیں گے جتنے باذوق اصحاب کو اور آج کی خواتین کی پسند درحقیقت کل کی جنریشن کی ماؤں کی پسند ہے جو وہ اپنی اولاد کو منتقل کریں گی۔ میری دعا ہے ریحان صاحب کو اپنی اس کاوش کا بہترین صلہ ملے۔

نام کتاب: اللہ میں صبر کروں گی/مصنف: اظہر محمود شیخ/صفحات: 93/ قیمت: 80روپے/فلیپ: جاوید چودھری
ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

''اللہ میں صبر کروں گی'' اظہر محمود شیخ صاحب کی کتاب کے معصوم فرشتوں سے آپ پاکستان بھر کے بچوں کے ہسپتالوں، تھیلیسیمیا، ہیموفیلیا مراکز اور بلڈ بینکس کے وارڈز میں جا کر ملاقات کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کے تمام کردار ''معصوم فرشتے'' گناہوں، نفرت اور حسد سے پاک بغیر پروں والے فرشتے ہیں جو آپ کی راہ تک رہے ہیں۔ آپ کے چند قطرے خون کے عطیات ان کی سانسوں کو بڑھا سکتے ہیں۔ ایک بیوہ غریب عورت کی آخری اُمید کے دیے کو روشن رکھ سکتے ہیں۔ آپ ہر تین چار ماہ بعد یہ صدقہ جاریہ کر سکتے ہیں۔ اپنی جان بھی بچا سکتے ہیں کہ عطیہ خون سے پہلے آپ کے ہیپاٹائٹس بی، سی، ملیریا، ایڈز اور خون گروپ کے مکمل ٹیسٹ ہوتے ہیں۔

نام کتاب: اقرار/شاعر: اقرار مصطفیٰ/صفحات: 248/ قیمت: 480روپے/تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد افتخار شفیع
ناشر: کمال پبلشرز، لاہور، اوکاڑہ، کمالیہ

اقرار مصطفیٰ کی شاعری اس بات کی شاہد ہے کہ وہ غزل کے قدیم و جدید لہجوں سے آشنا ہیں۔ ان کے یہ اشعار نہیں بلکہ اپنے بطن میں قیامتیں چھپائے لفظی شہ پارے ہیں یا زندگی کے گہرے کرب کی داستانیں ہیں۔ جو حروف کا چغہ پہن کر سیر افلاک کو روانہ ہوتی ہیں اور کبھی زمیں کی نوحہ گری کرنے لگتی ہیں۔ ان میں اقرار مصطفیٰ کے عہد کی بدترین ناانصافی کا دکھ بھی ہے اور شگفتگی، برجستگی اور سوختگی کے مضامین بھی۔ کہیں کہیں اس ذاتی اور کائناتی غم کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی ہمارے شاعر کا کمال ہے کہ وہ اپنے غم کو اس نامعلوم طریقے سے جزو خیال بناتا ہے کہ مصرعوں کے اندرون کا وجود بعینہ اس طرح جھلکتا ہے جیسے چراغ کے اندر سے اس کی روشنی کا سراغ ملتا ہے۔

نام کتاب: نعت عبادت میری اے/مرتب: ہمایوں پروفیسر شاہد/صفحات: 240/ قیمت: 500روپے/تبصرہ نگار: عمران سلیم
ناشر: گلشن ادب پبلی کیشنز آؤٹ فال روڈ، لاہور

ہمایوں پرویز شاہد نے تقریباً 139 شاعراں دیاں نعتاں کٹھیاں کیتیاں۔ ایس کم نوں اک عاشق رسولؐ ای انجام دے سکدا اے۔ مثال اے لکڑ نال لوہا وی تر جاندا اے تے ایہہ مثال میرے تے بالکل پچی اے۔ کیوں جے ہمایوں پرویز شاہد دی آقا نال محبت نے میں نوں وی ایہہ موقع فراہم کیتا کہ میں اپنے گناہواں دی کالکھ دھوون لئی اپنے آقا دے کامیاں وچ اپنا ناں لکھوالواں۔ میری دعا اے کہ رب تے اوہدا محبوبؐ ہمایوں پرویز شاہد دے جذبیاں نوں شرف قبولیت عطا کرن تے ہمایوں پرویز شاہد دا فن دن دوگنی تے رات چوگنی ترقی کردا رہوے۔

نام کتاب: نوید سحر/شاعر: جسارت خیالی/صفحات: 104/ قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار: سہیل ثاقب
ناشر: یو-اردو سخن چوک اعظم، لیہ

ضلع لیہ کے معروف شاعر جناب جسارت خیالی کا تعلق ڈاکٹر خیال امروہوی کے دبستان سے ہے اور وہ کمال استقلال سے سرمایہ دار استحصالی طبقوں کے خلاف اور مزدوروں، محروموں اور پسے ہوئے عوام کے حق میں مسلسل لکھ رہے ہیں۔ معاشرے کی ناآسودگیاں، ناانصافیاں اور محرومیاں انکی شاعری کا واضح جزو ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے قومی ترقی اور انسانی معراج کی معتبر راہیں تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ہاں شعری اسلوب روایت پسندانہ، طرز بیاں تلخ اور نظریات جاندار ہیں۔ صداقت پسندی ان کی شاعری میں نمایاں ہے جو یقینی طور پر ان کی تلخ گوئیوں کا سبب بھی ہے۔ انہیں شعر گوئی پر قدرت حاصل ہے اور زیر مطالعہ کتاب ''نوید سحر'' اردو انقلابی ادب میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی حقدار ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔

نام کتاب: طیبہ لے چلو/شاعر: ڈاکٹر اخلاق گیلانی/صفحات: 240/ قیمت: 350روپے/تبصرہ نگار: ریاض حسین زیدی
ناشر: کانٹی نینٹل اسٹار پبلشرز، لاہور

اخلاق گیلانی نے بے ساختہ انداز میں نعت کے سانچے میں ڈھلنے کا ارادہ کیا تو نعت کے کھلے بازوؤں نے ان کے ذہنی اور قلبی دریچوں کو ہوائے تر و تازہ سے نوازا اور وہ نہایت فطری انداز میں نعت کہتے گئے اور اب یہ حال ہے کہ وہ نعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہیں۔ ''طیبہ لے چلو'' کی نعتوں کے فنی اور فکری پیرائے میں ان کے قلم نے وقف کر چکے ہیں۔ ''طیبہ لے چلو'' کی نعتوں کے فنی اور فکری پیرائے میں ان کے قلم نے مسلمانوں کے محکم ترین عقیدے یعنی ''نعت'' کے ضمن میں مدحت کے

انمول موتیوں کو لفظوں کی مالائیں پہنا دی ہیں۔ کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے شعوری طور پر یا چند مسلمہ ضابطوں اور شعری سانچوں کو مدنظر رکھ کر ''آورد'' کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے دل کی بات بغیر کسی تردّد کے صاف صاف بیان کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ زیادہ تر سہل ممتنع کی دل کشی ان اشعارِ نعت کو نہایت احسن اور خوبصورت بنا رہی ہے۔ صنائع بدائع یا علم بیان کی دل آویزی خود بخود اُن کے قلم سے ادا ہوئی ہے۔ ان کے لبوں پر سلام کے پھول کھلتے ہیں اور وہ نعت سرائی کے مقدس مراحل سے بخیر و خوبی اور بآسانی گزرتے جاتے ہیں۔ اس طرح ہر نعت کا بہاؤ فطری اور بے ساختہ ہے۔ جس طرح صاحب نعت کا ہر پہلو نہایت واضح ہے اسی طرح اخلاق گیلانی نے یہ شرف پالیا ہے کہ وہ سچے جذبوں کو سچے اور رواں دواں پیرائے میں بیان کریں نہ کہ فلسفیانہ موشگافیوں اور شعوری زبان دانی کو اپنائیں اور نعت سے لطف اندوز ہونے والوں کو مشکل، ادق اور دشوار دقتوں میں مبتلا کریں۔ میں نے ان تمام نعتوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور ان کی خوش دلانہ سادگی اور عام فہمی کے جوہر سے خاصا محظوظ ہوا ہوں۔ مزید اشعار کے حوالوں سے میں اپنے موقف کو طول دینے سے گریز کرتے ہوئے کہوں گا کہ اخلاق گیلانی نے جناب جعفر شیرازی اور محترم محمد بشیر رزمی کی صحبتوں سے فیضیاب ہونے کا ٹھوس ثبوت فراہم کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ میں نے ادب سرائے ساہیوال کے پلیٹ فارم پر ان کی موجودگی اور شعر خوانی سے اندازہ لگا لیا تھا کہ سائنس اور بالخصوص کیمیا جیسے بے ذوق مضمون میں ید طولیٰ رکھنے والا شعر کی دنیا میں کیا کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ الحمد للہ کہ ان کے غزل کے سرمایہ افتخار کو جانچنے اور داد دینے کے بعد اُن کا نعتیہ مجموعہ ''طیبہ لے چلو'' پڑھ کر مزہ آ گیا اور ایک سائنس دان اُستاد کے قلم سے نعت کے انمول خزانے نہایت قرینے، ڈھب اور سلیقے سے صفحۂ قرطاس پر جلوہ افروز ہوتا دیکھ کر کہہ اُٹھا ہوں: طیبہ لے چلو کی نعت کا آہنگ زندہ باد.........اخلاق کی ہر نعت کا ہر رنگ زندہ باد

نام کتاب: صراطِ نور/ شاعر: اشفاق احمد غوری/ صفحات: 222/ قیمت: 300 روپے/ تبصرہ نگار: اشفاق احمد غوری

ناشر: حلقہ اہل قلم، پاکستان

نعت حبیبِ کبریاؐ سکونِ قلب بھی ہے اور طمانیتِ روح بھی۔ اس میں حسنات و برکاتؑ کے حصول کی اِلتجائیں بھی ہیں اور طلبِ حسن و کرم بھی۔ اسی میں حیاتِ جاودانی بھی مستور ہے اور فلاحِ دارین بھی۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ خوشنودیٔ ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے جمال و کمالاتِ مصطفیٰؐ کا تذکرہ لازم ہے۔ اردو زبان کو بھی یہ سعادت حاصل رہی ہے کہ ابتدائی زمانے سے ہی اسے دامن نعت نصیب ہوا۔ ہر زمانے اور ہر عہد میں شعراء نے اس صنفِ ادب کے احترام و اکرام کو مقدم جانا۔ تقریباً ہر شاعر نے نعت گوئی کو اپنے لیے سعادتوں اور رحمتوں کا خزینہ سمجھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے اور ہیں کہ جنہوں نے نعتِ محبوب کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہوا ہے۔ جناب اشفاق احمد غوری بھی ایسے ہی خوش نصیب ہیں کہ جن کی متاعِ ہنر حمد و نعت ہے۔ محبتِ رسولؐ میں سرشاری کی دولت نے جناب اشفاق احمد غوری کے اندر محبتوں اور عقیدتوں کے جہان کو ان کی اوّلین نگارش ''صراطِ نور'' کے روپ میں منصۂ شہود پر لانے کی سعادت بخشی ہے۔

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگِ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

نامہ ہائے احباب

جناب حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون۔ آپ جس باقاعدگی کے ساتھ "ارژنگ" شائع کر رہے ہیں اور مجھے بھجواتے ہیں اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ میرا یہ خط اس بات کی رسید بھی ہے کہ مجھے "ارژنگ" باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ احباب کی نثری و شعری نگارشات پڑھ کر طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے ادبی جرائد یقیناً تخلیقی روابطے کا ذریعہ ہیں ورنہ تو اب علم و ادب سے بے اعتنائی بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ جو دل کی دوا بیچتے تھے، دکان اپنی بڑھا گئے ہیں اور خریدار بھی گھٹتے جا رہے ہیں۔ ہمیں مرغن کھانوں سے فرصت ملے تو مطالعے، مشاہدے اور تدبر کا خیال آئے۔ آپ کے لیے بہت سی محبتیں۔

ایوب ندیم

۲۰ جنوری ۲۰۱۷ء

حسن بھائی سلامت رہیں۔

ارژنگ مجھے اکثر ملتا رہتا ہے۔ غالباً یہ رانا صاحب میاں چنوں سے پوسٹ کرتے ہیں اور یہ میرے پرانے ایڈریس پر آتا ہے۔ اب میں اپنا گھر اور یونیورسٹی کا ایڈریس لکھ رہا ہوں۔ ان میں سے کسی ایک پر شمارہ ارسال کر دیا کریں۔ آپ کی تخلیقات اکثر پڑھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں کہ ہمارا بھائی اور دوست شعر و ادب کے اُفق کا ماہ منیر بن چکا ہے۔ سلامت رہیے۔

پیارے دوست ابرار ندیم کے لیے بہت سا سلام۔

ڈاکٹر شفیق آصف

جناب حسن عباسی صاحب! آداب

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ "ارژنگ" موصول ہو گیا۔ شکریہ!!

بہت خوبصورت اور جاندار ادبی پرچہ ہے۔ جو آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بہت عمدہ تحریریں اور شاعری بہت عمدہ انتخاب۔

میرے خط میں نہیں جانتی کہ آپ تک پہنچے کہ نہیں۔ اب دراصل نیٹ کا دور ہے۔ لوگ E.mail کی سہولت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ وہی دقیانوسی خیالات خط لکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ ایک شاعر کی غزلیں یا گوشہ جو آپ ترتیب دیتے ہیں اس میں ابھی تک میرا نمبر نہیں آیا۔ انتظار ہے۔ "ارژنگ" کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتی اور بھیجتی رہی ہوں۔ اس مرتبہ مشکور حسین صاحب کا انٹرویو بہت اچھا لگا۔ قاسمی صاحب کی تحریریں ہمیشہ بہت شگفتہ ہوتی ہیں۔ افسانے بھی پسند آئے اور شاعری کی اپنی جگہ ہے۔ ایک غزل پیش خدمت ہے۔ سلامت رہیے۔

آسناتھ کنول

جناب محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کو مخاطب کرتے ہوئے جانے کیوں نوابانِ بہاول پور کی شان و شوکت ذہن کے دریچوں میں گونجنے لگتی ہے اور پھر یونہی سلطنت بنو عباس کے کنگرے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ معاملہ جو بھی ہو آپکو اخلاص کے رنگوں میں منعکس دیکھتا ہوں۔ اپنے کام میں، عزیزوں میں اور خدمات ادب میں آپ سراپا اخلاص نظر آتے ہیں۔ مثلاً ارژنگ کا شمارہ جنوری 2017 آپ کی محنت شاقہ کا نفیس اور عمدہ ثبوت دے رہا ہے۔ ادبی جواہر پارے اپنی اپنی جگہ، جابجا دمک رہے ہیں کہ دل عش عش کرتا ہے۔ چند جواہر پارے تذکرے کے متقاضی ہیں۔ جیسے اللہ یار ثاقب نے محترم افتخار شفیع کی ادبی خدمات اور شوق و جستجو کو جس محبت اور عقیدت میں پرویا ہے وہ بے مثل ہے۔ بلکہ دیگر قلمکاروں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ بھی ایسے ہیرے پیش کریں۔ بلاشبہ افتخار شفیع سرمایہ ادب ہیں۔ وجاہت تبسم کا سبق آموز اور محنت شاقہ سے تیار کیا گیا مضمون ہندی اور اردو عروض کا تقابلی مطالعہ زبردست ہے۔ وجاہت کو مبارک اور تحسین پیش ہے۔ قتیل شفائی، صاحب پر قاسمی صاحب کی بے تکلف اور انکشاف آمیز تحریر ہے۔ جناب اسلم کولسری کا ذکر اچھا رہا لیکن اس قدر بلند قامت کہ سالک انسان کو بہت کم پذیرائی دی ہے تشنگی رہی۔ اس شمارے میں جناب بزرگ مشکور حسین یاد کا مکالمہ، کمال درجے کا ہے۔

بہت ساری باتیں معلوم ہوئیں۔ ایسے بزرگ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ سیرت میں بھی اور خدمات میں بھی یہ لوگ اسم بامسمٰی ہوتے ہیں۔

ایوب صابر کا افسانہ 'بے جان پیادہ' ہر لحاظ سے پرکھا۔ افسانوی رنگ کا فقدان ہی رہا۔ یوں کھٹک رہا تھا جیسے آدمی سفرنامہ یا تاریخ کی کتاب پڑھ رہا ہو۔ پلاٹ بھی سادہ تھا، افسانے کو افسانہ ہی ہونا چاہیے۔ یہ تنقید نہیں میرے ذاتی محسوسات ہیں۔

ادبی خبروں کا حصہ ہمیشہ کی طرح قدرے بیگانہ سا رہا۔ عباسی صاحب ادبی خبریں کیا لاہور تک محدود ہوتی ہیں۔ وطن عزیز یا دنیائے ادب میں کوئی اور خبر نہیں ہوتی۔ اس حصے کو دینے کی بجائے نکھرنا چاہیے۔ شعراء حضرات کو تا حال پڑھا نہیں۔ آپکو ایک افسانہ بھجوا رہا ہوں۔ قریبی اشاعت میں رکھ کر شکریے کا موقع دیں۔ والسلام

گل زیب عباسی، بہاول نگر

پیارے حسن بھائی!

''آداب!'' جنوری کا شمارہ قوس خیال کے سارے رنگ لے کر جلوہ افروز ہوا۔ ہمیشہ کی طرح ٹائیٹل بے مثال، ٹائٹل لاجواب اور ٹائٹل پر غالب کا شعر برہمن کی زبانی نوید سنا رہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اس ادارے اور اس ملک کے لیے سچ مچ یہ سال اچھا ہو۔ خیر و عافیت والا، امن اور سلامتی والا ٹائٹل ہی کے اندر والی سائیڈ پر ''منظور حسین یاد'' عامر بن علی کے ساتھ اپنے انداز میں بیٹھے کہہ رہے تھے ''زندگی تھوڑی بچی ہے، اس لیے زیادہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں'' حمد و نعت میں خورشید بیگ میلسوی، سید ریاض حسین زیدی، اکرم ناصر، احمد جلیل اوکاڑہ کی نگارشات لطف دے گئیں۔ ''اسلم کولسری کی رخصتی بچھڑنے کا غم بھی سنا رہی تھی اور یہ بھی بتا رہی تھی کہ اسلم کولسری کے نام کے ساتھ کولسری کیوں لکھا کرتے تھے۔

ریاض ندیم کس عمدہ انداز میں علی رضا کی ثنائے سرور کا تعارف اور عشق رسولؐ میں ڈوبے اشعار کی گرہیں کھول رہے تھے۔ ذرا آگے ڈاکٹر افتخار شفیع کی تحقیقی اور تنقیدی جہات کی صورت میں اللہ یار ثاقب کا تفصیلی مضمون پڑھنے کو ملا۔ نازیہ نیاز کا حسن عباسی کی نظم کا فنی تجزیہ ہندی اور اردو عروض کا تقابلی مطالعہ بھی خاصے کی تحریریں تھیں۔ ایوب صابر کا ''بے جان پیادہ'' اُن کے اسلوب اور افسانہ کی جدت کو بیان کر رہا تھا۔ زاہد محمود شمس کی طویل نظم پروین شاکر کی یاد میں کیا خوبصورت منظر پیش کر رہی تھی۔ لفظوں کی بنت کاری اُن کے ہنر کو بھی صاف عیاں کر رہی تھی۔ ادبی گوشے، تبصرہ کتب بھی عمدہ اور معلوماتی سلسلے ہیں۔ حسن عباسی کی گفتگو محمد ادریس لاہوری سے جس میں کہہ رہے ہیں لاہور سے بے پناہ ''محبت کی وجہ'' سے اپنے نام کے ساتھ ''لاہوری'' لگایا۔ پردیس میں بسنے والوں کے حوالے سے اچھا سلسلہ ہے۔ آپ کی ادارتی صلاحیتوں کو سلام

خالق آرزو

نظم

حسن کی بارگاہ میں آ کر
اپنے فن پر نظر پڑی تو کھلا
کس قدر خوش گمانیاں ہیں مجھے
لفظ پر دسترس کے بارے میں
سوچ کے ان گنت حوالوں پر
رنگ کی تمکنت کے بارے میں
حسن کی بارگاہ میں الفاظ
نارسائی کا درد سہتے ہیں
کم ہی لگتا ہے جو بھی کہتے ہیں
سوچ کے جتنے زاویے ہیں بھی
حسن دیکھیں تو سر کو خم کر دیں
اس سے پہلے کہ شان کم کر دیں
رنگ اُس کے لیے بنے ہیں بھی
وہ جو اوڑھے کمال ہو جائے
وہ جو پہنے مثال ہو جائے
مجھ پہ چھایا ہے پانچواں موسم
ایک اُمید اور کرن کی طرح
ایک پیغام اک سخن کی طرح
آج پھر حسن بے بدل دیکھا
جو مقدر میں بھی نظر آیا
دیکھتا تھا جسے تصور میں
آج تصویر میں نظر آیا

احمد سبحانی آکاش/لاہور

وقت کی پکار، سیاسی انقلاب

(کالم) پروفیسر رشید احمد انگوی

صفحات: 96 قیمت: -/200 روپے

ناشر: نستعلیق مطبوعات، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

ماہنامہ "ارژنگ" کو وصول ہونے والے ادبی جرائد

ماہنامہ طلوعِ اشک

چیف ایڈیٹر: رائے عابد علی

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

رابطہ: ۰۳۰۰-۴۸۵۰۴۲۱

ششماہی ترنجن

چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر اصغر صدف

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج،

آرٹ اینڈ کلچر، نزد قذافی سٹیڈیم لاہور

ماہنامہ نوائے ادب

مدیرِ اعلیٰ: صدام ساگر

فی قیمت شمارہ: -/۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: سکن سنٹر بالمقابل دفتر فوڈ

سول ہسپتال روڈ، گوجرانوالہ

ششماہی رنگِ ادب

مدیر: شاعر علی شاعر

قیمت فی شمارہ: -/۵۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: رنگِ ادب پبلی کیشنز

آفس نمبر ۵ کتاب مارکیٹ اُردو بازار کراچی

ماہنامہ مجلس ترقی ادب

مدیر: محمد ظہیر بدر

ملنے کا پتہ: نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ اپر مال لاہور

ماہنامہ بیاض

مدیر: عمران منظور

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ۔ ریاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ ۱۶ کلومیٹر ملتان روڈ لاہور

ماہنامہ تخلیق

مدیر: سونان اظہر جاوید

قیمت فی شمارہ: -/۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: ہاؤس نمبر ۱۲/۴ شیراز ولاز فیز

اسلام نگر والٹن روڈ لاہور کینٹ

سہ ماہی چہار سُو

مدیر: سُول گلزار جاوید

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: 1-D 372 گلی نمبر ۱۸ ویسٹرج III راولپنڈی

ماہنامہ تارکینِ وطن

چیف ایڈیٹر: میاں منظور شاہد

قیمت فی شمارہ: -/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: ۴۹ کشمیر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

زمیں سے ہے نہ ہمیں آسماں سے خطرہ ہے
تری نگاہوں کے جادو بیاں سے خطرہ ہے

ہزار چاند مرے راستے میں ہیں لیکن
ستارہ آنکھوں کی اب کہکشاں سے خطرہ ہے

غریب شہر کے تو مسئلے نہ حل ہوں گے
امیرِ شہر کو اس داستاں سے خطرہ ہے

مرے وطن میں بھی نادان ہیں بہت ایسے
جو کہتے ہیں ہمیں اُردو زباں سے خطرہ ہے

گلوں کی پتیاں مرجھاتی جاتی ہیں ہیم
چمن کو اپنے یہاں باغباں سے خطرہ ہے

یہ اہلِ بزم کہیں سو نہ جائیں سنتے ہوئے
بڑی طویل تری داستاں سے خطرہ ہے

تمہارا لطف و کرم ہم پہ گر نہ ہو یارب
یقیں سے خطرہ ہے ہم کو گماں سے خطرہ ہے

عجیب دور ہے نامہربانیوں کا یہاں
ہمیں تو اپنے ہر اک مہرباں سے خطرہ ہے

کھلاڑی خطروں کے ہم اس طرح سے ہیں مسعود
کہ جن کو اپنے سدا گلستاں سے خطرہ ہے

شاعر اور سفر نامہ نگار

حسن عباسی

کے پہلے حمدیہ شعری مجموعے **سائیں**

کے بعد اُن کا دوسرا حمدیہ شعری مجموعہ

صاحِب

دیدہ زیب اشاعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔

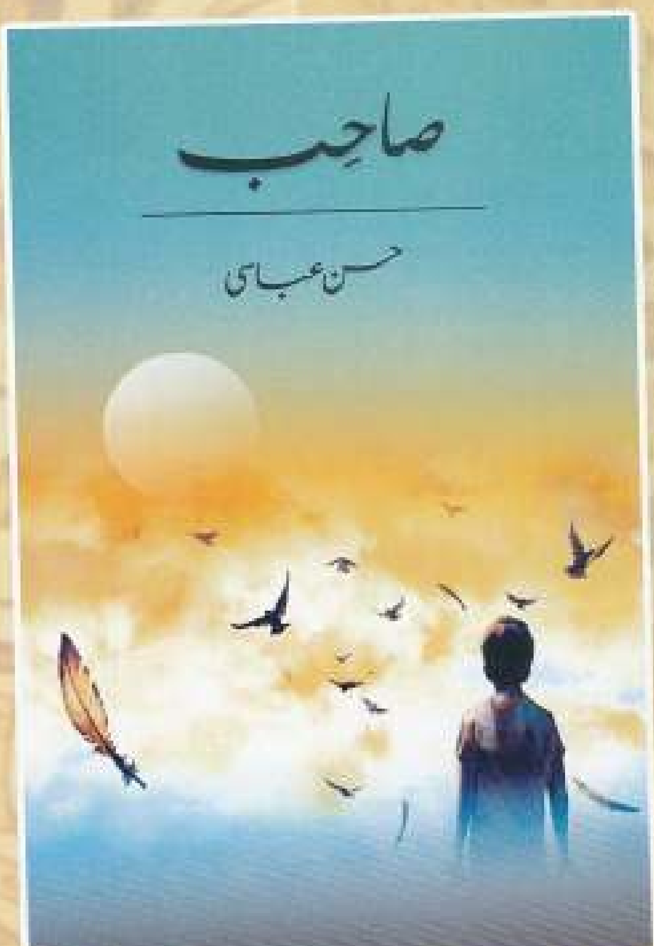

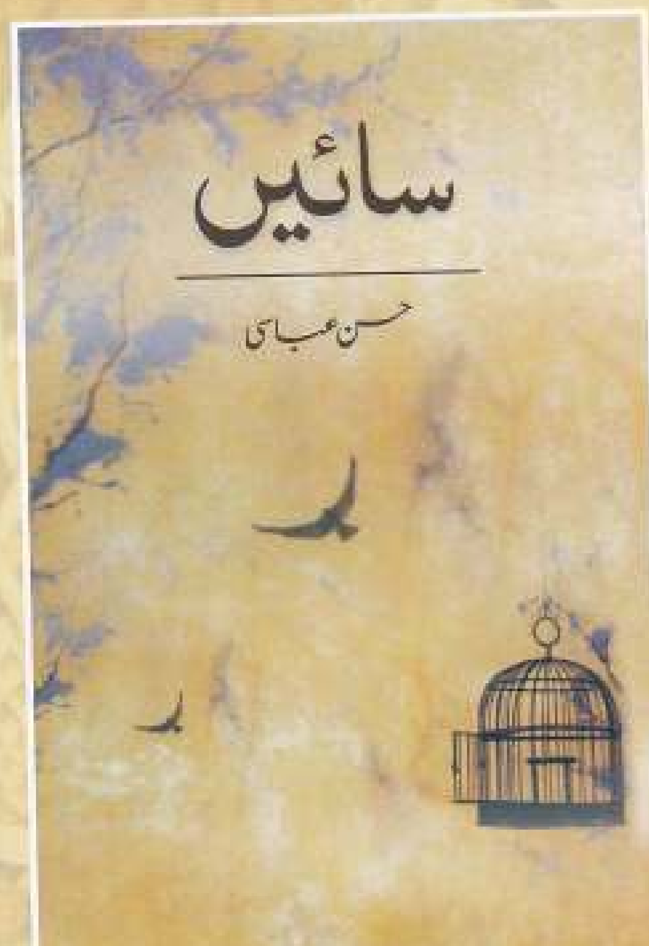

ناشر نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور

0300-4489310-0331-4489310

nastalique786@gmail.com

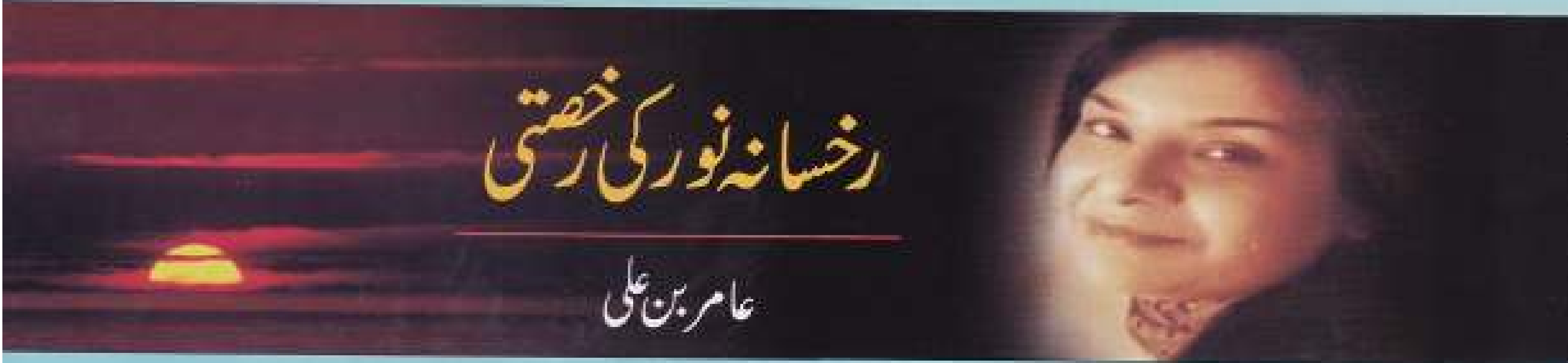

رخسانہ نور کی رخصتی

عامر بن علی

معروف شاعرہ، صحافی، ادیبہ اور فلم رائٹر رخسانہ نور اب ہم میں نہیں رہیں۔ انہوں نے کینسر کے موذی مرض کا بڑا طویل عرصہ، انتہائی بہادری اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ بالآخر گزشتہ روز اٹھاون سال کی مختصر عمر میں زندگی کی بازی ہار گئیں۔ ان کے گیتوں کا مجموعہ ''آ پیار دل میں جگا'' کے نام سے شائع ہوا تھا اور شعری مجموعہ ''الہام'' کے نام سے طباعت پذیر ہوا۔ ان دنوں ان کا ایک شعری مجموعہ زیر طباعت تھا جس کا اہتمام میرے ادیب دوست ڈاکٹر صغرا صدف اور حسن عباسی کر رہے ہیں۔

رخسانہ نور نے اپنے صحافی کیریئر کا آغاز روزنامہ جنگ سے بطور فیچر رائٹر کیا تھا۔ شوہر نامدار فلمساز سید نور سے ان کی پہلی ملاقات بھی روزنامہ جنگ کے لیے کیے گئے ایک انٹرویو کے سلسلے میں ہی ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ رخسانہ آرزو کے نام سے لکھا کرتی تھیں سیالکوٹ ضلع کے علاقے پسرور میں پیدا ہوئیں مگر بعد ازاں ان کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغیات سے جب انہوں نے ایم۔ اے کیا تو اسی وقت شعبہ جرنلزم کے صدر نے انہیں اسی شعبے میں پڑھانے کی پیشکش کی تھی۔ اس وقت انہوں نے بوجوہ یہ آفر قبول نہیں کی۔ مگر ازراہِ تفنن کہا کرتیں کہ میں نے شعبہ ابلاغیات میں پڑھانے کی نوکری والی آفر قبول کرنے میں پچیس سال لگا دیے۔ پڑھنے، لکھنے سے رخسانہ کو عشق تھا۔ جب پنجاب یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کیا تو اکثر کہتیں کہ پڑھنے، پڑھانے سے اچھا کام اور کوئی بھی نہیں، یہ دنیا کا افضل ترین کام ہے۔

پنجاب یونیورسٹی میں تدریس کا کام انہوں نے فلمساز سید نور کی اداکارہ صائمہ کے ساتھ دوسری شادی کے بعد غالباً شروع کیا تھا۔ سید نور کی دوسری شادی کا انہیں شدید صدمہ تھا۔ مگر کسی کے سامنے ایک حرف بھی شکایت کا کبھی ان کی زبان پر نہیں آیا، انہوں نے فلمساز سید نور کو اپنی آخری سانس تک مجازی خدا ہی بنا کر رکھا۔ البتہ اس واقعہ کے بہت دن بعد تک ان کی آنکھیں روئی ہوئی لگتی تھیں۔ اداکارہ صائمہ کے پس منظر کو جتنا بھی مہذب اور ملفوف الفاظ کا لبادہ اوڑھا دیا جائے وہ بہر حال رخسانہ نور جیسا تو قطعاً نہیں تھا۔ فلمی پس منظر کا علمی پس منظر سے موازنہ یا مقابلہ میرا مقصد نہیں۔ ہمارے ہاں عموماً یہ مختلف شعبہ جات سمجھے جاتے ہیں۔ فلمی پس منظر کو حقیر کیسے کہہ دوں کہ رخسانہ نور نے خود درجن سے زیادہ سپر ہٹ فلموں کا اسکرپٹ لکھا تھا، جن میں لڑکی پنجابن، چوڑیاں، مجاجن، جھومر، دوپٹہ جل رہا ہے، سنگم، مہندی والے ہتھ، ناگ اور ناگن اور اس کے علاوہ بھی ایک طویل فہرست ہے۔

فلمی دنیا کو عالمی طور پر تصنع، رنگ و روغن اور جھوٹ کی دنیا سمجھا جاتا ہے، جو پل پل رنگ بدلتی ہے، یہ تاثر بڑی حد تک درست بھی ہے، مگر اتنی ساری ہٹ فلمیں کرنے کے باوجود رخسانہ نور پر تو فلمی دنیا کی ان قباحتوں کی پرچھائی تک نہ تھی۔ تصنع تو اسے چھو کر بھی نہ گزرا تھا اور ایسی بے دریغ سچ بولنے والی شخصیات تو میں نے اپنی زندگی میں کم کم ہی دیکھی ہیں جیسی رخسانہ تھی، عجز و انکساری مثالوں جیسی اور نرم خو طبیعت ایسی کہ تصور کرنا مشکل تھا کہ انہیں غصہ کیسے آتا ہوگا؟ ظرف اور دل میری اس دوست کے دونوں ہی اعلیٰ و بے مثال تھے، سب کو معاف کر دینے کا حوصلہ اور ہمت رکھتی تھیں۔ ایسا حوصلہ اس زمانے میں ملنا بڑی مشکل بات ہے۔

سنا ہے عورتیں عموماً بڑی غیبت پسند ہوتی ہیں، مگر دوستوں کے کان ترس جاتے کہ رخسانہ نور کے منہ سے بھی کسی کی غیبت سنیں، دوستوں کا تو ذکر ہی کیا، دشمنوں کی بھی وہ غیبت کرنا گوارا نہ کرتی تھیں۔ اٹھاون سال کی مختصر مگر بامعنی زندگی گزارنے والی رخسانہ نور نے پسماندگان میں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑا ہے۔ پاکستان کی ادبی اور صحافتی برادری ایک مخلص دوست اور ہمدرد ساتھی سے محروم ہو گئی ہے۔ علمی و ادبی حلقوں میں ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید کبھی پورا نہ ہو سکے۔ گو کہ ان کی خوبصورت شاعری اور تحریریں ہمارے ساتھ ہیں مگر رخسانہ نور کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔